پونچھ راجوری کا ادبی منظر نامہ

تالیف

غنی غیور

POONCH RAJOURI KA ADABI MANZAR NAMAH

Ghani Ghayoor

Year of Edition 12 May 2025
ISBN :
Price : 399/-

نام کتاب : پونچھ راجوری کا ادبی منظر نامہ
تالیف : عبدالغنی جاگل (غنی غیورؔ)
سن اشاعت : ۱۲ر مئی ۲۰۲۵ء
تعداد : 300
قیمت : 299/-
کمپوزنگ : فوزیہ کمپیوٹر سنٹر جموں 9906063200
پبلشر :

پتہ

Top Hill, Near Green Valley Colony
Upper Jallalabad Sunjwan, Jammu
Pin Code 181152
Mobile No. +91-9419791802 | 7889837758

پونچھ راجوری کا ادبی خاکہ

۱۸۱۹ عیسوی اور اس کے بعد سکھا شاہی اور گلاب سنگھ کے بھتیجے موتی سنگھ کے پونچھ کا حکمران بننے کے دور میں سرکاری زبان فارسی ہی رہی۔ ۱۸۵۲ عیسوی میں بلدیو سنگھ نے بقول ڈاکٹر صغیر خان ''جب اردو سارے برصغیر میں پنجے گاڑ چکی تھی تو بدلتے حالات کے تحت سرکاری زبان قرار دی گئی''۔

بحوالہ شمارہ : ۱۲ اخبار اسلام آباد لاہور صفحہ ۱۲ تا ۱۴

پونچھ میں بھی کشمیر کی طرح ،حصول علم، انتظامی و دیگر تعلقات، ذرایع مواصلات میں اردو زبان کا استعمال لازمی ہوگیا۔ جموں کی بزم سخن کی دیکھا دیکھی، پونچھ میں دیانند کپور اور ساتھیوں نے مل کر بزم ادب قائم کی۔ اسی بزم کی کاوشوں سے بہت سے ادبا اور شعرا سامنے آئے۔ پونچھ میں اردو کے حوالہ سے بعض مشاہیر کے اسمائے گرامی یوں ہیں۔ منشی علی حسن خان (چراغ حسن حسرت کے نانا) روپ چند احقر، لالہ ہر چند داس، ولی محمد، امام دین ہُد ہُد، منشی صادق علی، نبی بخش نظامی، سرون ناتھ آفتاب، دینا ناتھ رفیق، ضیاء الحسن ضیا، دیانند کپور، موتی لعل کپور، دیوان دت، بہاری لعل شاستری، تحسین جعفری، بدری ناتھ پوری، مالک رام آنند (جو بعد میں پیر مٹھا جموں آ بسے

تھے) کرشن چندر، ٹھاکر پونچھی، گرداری لعل برق، بلدیو راج رہبر، خواجہ محمد الدین بانڈے، مسعود الحسن مسعود، حسام الدین بیتاب محمد نظیر قریشی، فاروق مضطر، محمود الحسن محمود، شہباز راجوری، فدا راجوروی، ان حضرات نے اردو ادب کے فروغ میں اہم کردار نبھایا۔

جنوری ۱۹۶۸ عیسوی تک راجوری بھی پونچھ ضلع کا حصہ تھا۔ اس وقت کے ضلع پونچھ میں اردو کا فروغ کہیں بیسویں صدی کے آغاز میں ہوا۔ اس سے پہلے شاعری کم اور اوٹ پٹانگ باتیں زیادہ لکھی جاتی تھیں۔ راجہ پونچھ کے دربار سے منسلک جج لاہور (پنجاب) سے پڑھ کر آتے تھے۔ ۱۹۴۷ عیسوی سے پہلے پونچھ راجوری کا براہ راست تعلق لاہور، کوٹلی اور میر پور سے تھا۔ ۱۹۴۷ عیسوی سے پہلے پونچھ میں صرف دو ہائی اسکول تھے یعنی ویکٹوریا ہائی اسکول اور اسلامیہ ہائی اسکول۔ ویکٹوریا ہائی اسکول ۱۹۴۷ عیسوی میں بند کر دیا گیا تھا۔ لہذا پونچھ راجوری کے مقابلے شروع ہی سے تعلیم کا مرکز رہا۔ اردو میں امام دین، شیخ سجاد احمد کے مزاحیہ چٹکلے، اور تک بندی عوام میں مشہور تھی۔ باضابطہ شاعری کا آغاز پرانے اساتذہ میں دینا ناتھ رفیق نے ہی کیا۔ رفیق، کرشن چندر کے استاد تھے۔ مستند حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ جب کرشن چندر نے شعر و شاعری شروع کی تو اپنا ٹوٹا پھوٹا کلام دینا ناتھ رفیق کو دکھایا۔ دینا ناتھ رفیق نے کرشن چندر کے منہ پر ایسا تھپڑ رسید کیا کہ اُس کے اندر کا شاعر ہمیشہ کے لئے افسانوی دنیا میں کھو گیا۔ بہر حال رفیق غزلیں، نظمیں

خوب کہتے تھے۔''ان کے ساتھ ساتھ چراغ حسن حسرت اور تحسین جعفری نے پونچھ میں معیاری شاعری کی۔راجوری میں محمد اسماعیل ذبیح اور ان کے بھائی محمد اسرائیل مہجور بردار ان پیشہ سے معلم تھے نے مقامی ادب کے علاوہ اُردو کو بھی فروغ دیا۔

پونچھ راجوری میں افسانہ نگاری کا چلن بہت کم ہے۔کرشن چندر کا پونچھ سے کچھ تعلق رہا تھا۔حیرت کی بات ہے کہ ہم لوگ کرشن چندر کو پونچھ کا افسانہ نگار سمجھتے ہیں۔اس میں شک نہیں کہ انہیں پونچھ سے والہانہ محبت تھی اور انہوں نے اپنے افسانوں میں جابجا پونچھ کے دلفریب مناظر کا ذکر کیا ہے۔البتہ پونچھ راجوری کے مقامی افسانہ نگاروں جگن ناتھ ٹھاکر پونچھی (۱۹۲۲ تا ۱۹۷۴ عیسوی) کافی الحال کوئی جواب نہیں ملتا۔ٹھاکر پونچھی ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔سماجی ناہمواریوں کے موضوعات کو افسانوی قالب میں ڈھالتے رہے۔انکے افسانوی مجموعے، چاندنی کے سائے، یادوں کے کھنڈر، وادیاں اور ویرانے، شمع ہر رنگ میں جلتی ہے اور ڈیڈی، یادگار ادبی کارنامے ہیں جنہیں وہ نئی نسلوں کے حوالے کر گئے ہیں۔ان کے بعد مالک رام آنند کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ان کے علاوہ شفیق مسعود، زنفر کھوکھر، کے ڈی مینی نے بھی اردو افسانے لکھے ہیں۔سرنکوٹ سے محمد ایوب کے افسانوی مجموعہ شاہین کے بعد راقم عبدالغنی جاگل کا افسانوی مجموعہ''حکایت نیم شب'' شایع ہو چکا ہے۔لیکن مجموعی طور پر پونچھ راجوری میں افسانہ نگاری کی طرف زیادہ

دھیان نہیں دیا گیا۔شاید ادیبوں کو معلوم ہی نہیں تھا یہ صدی تخلیقی افسانوی ادب کی صدی ہے۔

۱۹۴۷ عیسوی یعنی آزادی کے بعد تمام شعبوں میں ترقی ہوئی تعلیم اور آمد و رفت کا نظام سڑکیں پُل بننے لگے۔مقامی لوگوں کو سرکاری نوکریاں ملنے لگیں عوامی نمائندے منتخب ہونے شروع ہوئے۔سیاسی سرگرمیوں نے عوام میں جاگیرتی کی لہر پیدا کی۔ دیہاتی لوگ بھی پڑھائی کی طرف راغب ہوئے۔آزادی کے بعد پونچھ راجوری میں پڑھے لکھے اساتذہ کشمیر سے آتے تھے۔ یا پھر جموں سے۔ یہ سلسلہ ۱۹۸۰ عیسوی کے بعد تک چلتا رہا۔رفتہ رفتہ بعض مقامی اساتذہ مستقل طور پر تعینات ہو گئے اسی دوران کہیں بیچ میں نااہل افراد اساتذہ کے طور پر تعینات ہو گئے۔سفارشی لوگ بھی روزگار کے چکر میں اساتذہ بن گئے نتیجتاً تعلیم کا معیار پست ہوتا گیا۔اور پرائیویٹ سیکٹر نے تعلیم میں اپنی کارکردگی بہتر بنا لی۔کئی پرائیویٹ اسکولوں نے اپنی شناخت قائم کی۔جب کسی قوم کو فراغت حاصل تو شاعروں کے کھیپیں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔حتی کہ ادب کے فروغ کے نام پر کہیں کہیں جعلی ادیبوں اور شعرا نے مواقع کا فائدہ اٹھایا۔لیکن اسکا مطلب ہر گز نہیں کہ سچے ادیبوں اور شعرا کا فقدان ہے۔خطۂ پیر پنجال میں اچھے اچھے قلم کار بھی موجود رہے ہیں اور تحقیق و تنقید کے میدان میں بھی کچھ کام ہوا ہے۔بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی میں اردو ڈیپارٹمنٹ کھل چکا ہے اور ڈاکٹر آصف ملک علیمیؔ اور ڈاکٹر لیاقت

نیر کے علاوہ راجوری کے پروفیسر عبدالحق نعیمیؔ اردو تحقیقات میں منہمک ہیں اور جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو بھی پونچھ، راجوری پر تحقیقات کا آغاز کر چکا ہے۔ ۲۰۰۷ء میں محترمہ گل اکثر نے حسام الدین بیتاب پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ایم فل کی سند حاصل کی ہے۔ راقم کی نئی اردو غزل شائع ہو چکی ہے۔ یہ سلسلہ رواں دواں ہے۔ بقول شاعر:

اب ہوائیں ہی کریں گی روشنی کا فیصلہ
جس دیے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا

یہ تلخ حقیقت ہے کہ ہمارے اکثر شعرا کتاب چھاپنے سے گریز کرتے ہیں۔ اسکی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ مثلاً عدمِ خود اعتمادی، مالی مشکلات، مواد کی کمی۔ اس مقالہ میں شامل شدہ کلام کافی غور وغوض اور تحقیق کے بعد ہی لیا کیا گیا ہے۔

پونچھ راجوری کی سرزمین زرخیز تو ہے لیکن شاید ہمارے شعرا اور ادباء راتوں رات بلندیاں چھو لینا چاہتے ہیں۔ اس صدی میں بھی میں اگر کسی کو انہماک و استغراق کے پیہم مواقع مل جائیں تو بڑی شاعری کے امکانات سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن سوشل میڈیا پر سستی شہرت کا فریب، ہمارے شعراء کے راستے کی رکاوٹ بن چکی ہے۔ شاعری میں لاکھ آمد ہو لیکن زبان ایک اکتسابی عمل ہے۔ ہمارے شعرا کو چاہئے کہ وہ مشق و مزاولت اور انتہائی ثابت قدمی (persistence) کے ساتھ مشقِ سخن جاری رکھیں۔

یہ کتاب اردو شاعری کے ان تخلیقی امکانات کو اُجاگر کرتی ہے جو نئی صدی کے حساس، فکر انگیز اور تہذیبی شعور سے مزین اشعار میں جھلکتے ہیں۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ زیرِ نظر کتاب ایسے شعری نمونوں سے مزیّن ہے جو نہ صرف فنی پختگی رکھتے ہیں بلکہ معنوی گہرائی اور فکری تازگی کا بھی مظہر ہیں۔ بلراج بخشی کا ایک شعر:

زمین پاؤں سے میرے لپٹ گئی ورنہ
میں آسمان سے تارے اُتار سکتا تھا
بلراج بخشی

زمیں سے بندھن کی یہ کیفیت، انسانی امکان کی پرواز پر جذباتی اور وجودی گرفت کا خوبصورت استعارہ ہے۔

پرتپال سنگھ بیتاب کا شعر :

اونچا پہاڑ چڑھ کے اترنا پڑا
جینے کا وقت آیا تو مرنا پڑا اسے

خالد کرار کا شعر:

ان کتابوں میں بس یہی ہے کمی
زیست کم فلسفہ زیادہ ہے

احمد شناس کا یہ شعر:

بچّے نکال لائے ہیں خبریں نئی نئی
بوڑھے فلک کی جیب سے چیزیں نئی نئی

نہایت سادہ پیرائے میں تجدد اور روایت کے مابین تخلیقی کشمکش کو بیان کرتا ہے، جہاں نئی نسل پرانی کائنات کی جیب سے نئی معنویت کشید کرتی دکھائی دیتی ہے۔

فاروق مضطر کا یہ شعر:

مگر ان آنکھوں میں کس صبح کے حوالے تھے
ہمارے نام کے سارے حروف کالے تھے

ایک اجتماعی تجربے کی مایوسی، ناانصافی، اور گم شدہ پہچان کا آئینہ بن جاتا ہے۔ فاروق مغل کی یہ سطریں:

میں ایک ذات کو محسوس کرتا رہتا ہوں
کبھی کسی کے علاوہ، کبھی کسی کے بغیر

وجودی تجربے اور انفرادی شعور کی نازک پرتوں کو اجاگر کرتی ہیں۔

امتیاز نسیم کا یہ شعر:

میں تو صحرا تھا مگر سبز ہوا جاتا ہوں
جانے کس کے جسم کو چھو کر یہ ہوا آتی ہے

تخیل، عشق اور اثر پذیری کا ایسا لطیف امتزاج ہے جس میں تحولِ ذات

کی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔

ذوالفقار نقوی کا ایک شعر

ٹیک لگا کر بیٹھا ہوں میں جس بوڑھی دیوار کے ساتھ
مٹ جاؤں گا میں بھی شاید اس کے ہر آثار کے ساتھ

یہ شعر نہایت پُر اثر انداز میں فنا، وقت اور یادوں کی شکستگی کا استعارہ بناتا ہے بیشک شاعر خود کو ایک پرانی دیوار سے وابستہ دکھا کر ماضی سے جڑی اپنی شناخت کے مٹ جانے کے اندیشے کو اجاگر کرتا ہے، گویا وجود کی بقا بھی اب زوال پذیر تاریخ کے ساتھ مشروط ہے۔

اور لیاقت جعفری کی یہ چوٹ:

مِرے قبیلے میں تعلیم کا رواج نہ تھا
مِرے بزرگ مگر تختیاں بنانے تھے

ایک ایسا شعر ہے جو سماجی تضادات، طبقاتی رکاوٹوں اور تہذیبی خود فریبی پر بے مثال طنز کی صورت میں ابھرتا ہے۔ ان اشعار کے توسط سے اردو شاعری میں جنم لینے والے علامتی، فکری اور جمالیاتی رجحانات کو نہ صرف شناخت دی گئی ہے بلکہ اُن پر سنجیدہ تجزیاتی مکالمہ بھی ممکن بنایا گیا ہے۔ یہ کتاب انہی رجحانات کا سراغ لگانے کی ایک شعوری کوشش ہے، تاکہ ہم نہ صرف عصرِ حاضر کی شاعری کو بہتر سمجھ سکیں، بلکہ اس کی روحانی اور فکری جہات کو بھی دریافت کر سکیں۔

باغی حدود سے بہت آگے نکل گئے
سورج چھوا نہ تھا کہ مرے ہاتھ جل گئے

اور

چیونٹیوں کے بل میں پانی ڈال کر
میں تماشا دیکھتا ہوں دیر تک

(غنی غیورؔ)

یہ اشعار میری اسی شعری کوشش کی جھلک ہیں جہاں تجربہ، علامت، طنز، اور تماشا سب ایک ہی کینوس پر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

آخر میں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ میں نے مصلحتاً ان مضامین کو، جو مختلف احباب نے ارسال کیے اور جن میں میرے فکر و فن اور ادبی سفر کا جائزہ لیا گیا ہے، اس مقالے کے آخر میں شامل کر دیا ہے۔ چونکہ میں نے خود بھی گاہے اہلِ قلم کے عمدہ کلام کا تنقیدی مطالعہ کیا ہے، اس لیے اپنے تخلیقی سفر کے کچھ معتبر حوالوں کو 'بزبانِ دیگران' پیش کرنا میرے نزدیک ناموزوں نہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں، مَیں نے پونچھ راجوری کے مقتدر شعرا کا مختصر ذکر مع نمونۂ کلام کیا پیش ہے بنیادی طور پر میری توجہ کا مرکز شاعری کی ہی صنف رہی ہے۔ زیرِ نظر کتاب فاروق مضطر صاحب کی تاکید پر ہی لکھی گئی انہوں نے میری ترتیب دی ہوئی کتاب کا مسودہ ہمالین ایجوکیشن مشن راجوری میں منعقدہ اردو کانفرنس 2023ء کے دوران ادباء و شعراء میں تقسیم کیا تھا۔ میں نے اسی

مقالے میں کچھ اضافہ کیا ہے ۔امید ہے کہ قارئین کو یہ کتاب پسند آئے گی جس میں پونچھ راجوری کے مقتدر شعراء کا نمونۂ کلام مع مختصر کوائف بیان کیا گیا ہے۔

شاعری کیا ہے کہ اک عمر گنوادی ہم نے
چند الفاظ کو امکان و اثر دینے میں

اس کتاب کی ترتیب کے دوران جو سب سے بڑی دشواری سامنے آئی، وہ مواد کی غیر مطبوعہ حیثیت تھی ۔متعدد شعرائے کرام ایسے تھے جن کا کلام ابھی تک بیاضوں، ذاتی یادداشتوں، یا ادبی نشستوں تک محدود تھا۔ کچھ اصحابِ قلم دنیا سے رخصت ہو چکے تھے اور ان کی بیاضیں وقت کی گرد میں گم ہو چکی تھیں؛ طباعت کے زیور سے آراستہ ہونا تو درکنار، ان کا کوئی مستند حوالہ بھی دستیاب نہ تھا۔ایسے حالات میں، میں نے ادبی رسائل کی ورق گردانی کی، محفلوں میں سنے ہوئے اشعار کو یادداشت سے محفوظ کیا، اور بعض معتبر احباب کی وساطت سے چند نادر نمونے حاصل کیے ۔سرون ناتھ آفتاب اور گرداری لعل برق، جیسے شعرا کا کلام اسی طرح محفوظ کیا گیا۔ کچھ شعرا کے قیمتی اشعار حسام الدین بیتاب، سجاد پونچھی جیسے عاشق ادب کی کاوشوں کی مرہونِ منت میرے سامنے آئے ۔ دینا ناتھ کی کتاب دستیاب نہ ہوسکی، مگر رسائل سے ان کا کچھ کلام میسر آیا۔ بشیر بھٹ کا کلام تاحال غیر مطبوعہ ہے، لیکن افسوس کہ ان کے منتشر اور بے ربط اشعار پر کئی خود ساختہ شعراء نے

اپنی روزی کا سامان کر رکھا ہے۔

تحقیقی مراحل میں کئی اصحاب سے مشورے کیے، مگر اکثر کی جانب سے سرد مہری کا سامنا بھی ہوا۔ البتہ میں یہاں ذوالفقار نقوی کا پروف ریڈنگ کے سلسلے میں شکر گزار ہوں۔ نیز اس سے پہلے کوئی مستند کتاب میری رہنمائی کے لیے موجود نہ تھی؛ ''ادبیاتِ پونچھ'' جیسی چند کتابیں نظر سے ضرور گزریں، لیکن دل یہی کہنے پر مجبور ہوا:

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

غالبؔ

میں نے اپنی بساط بھر کوشش کی، تن تنہا یہ کٹھن مرحلے طے کیے، اور طویل ریاضت کے بعد اس مخطوطے کو حتمی شکل دے کر قارئین کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ میں نہ تو دعویٰ رکھتا ہوں، نہ ہی خود کو آخری حوالہ مانتا ہوں، مگر اتنا ضرور کہوں گا:

سمندر کے شکم سے ہم نے لائے قیمتی موتی
کسے جا کر تھمائیں، تم بھی سوچو، ہم بھی سوچیں گے

المخلص

غنی غیور

۱۲ر مئی ۲۰۲۵ء

۱: چراغ حسن حسرت

۱۹۰۴ تا ۱۹۵۵ عیسوی

نقد جاں لے کر چلیں اس بزم میں
مصر کے بازار کی باتیں کریں
ان کے کوچے میں جو گزری ہے کہیں
سایۂ دیوار کی باتیں کریں

چراغ حسن حسرت

چراغ حسن حسرت کے دادا فقیر چند کپور کھتری تھے۔ جو بعد میں بدر الدین ہو گئے۔ چراغ حسن پونچھ میں پلے بڑھے- اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ شروع ہی سے ذہین وفطین تھے۔

۱۹۲۴ عیسوی کے آس پاس پنجاب یونیورسٹی سے بی اے پاس کی، عصر جدید، اخبار (کلکتہ) سے منسلک ہو گئے۔ پھر ابوالکلام سے رسم و راہ پیدا ہوئی تو ''پیغام'' اخبار میں کام کیا اور پھر لاہور منتقل ہو گئے اور ''زمیندر'' (لاہور) کی ادرات کی۔ کولمبس اور سند باد جہازی کے نام سے فکاہیہ کالم لکھتے رہے۔ چراغ حسن حسرت پونچھ کے پہلے بڑے ادیب اور صحافی تھے۔ جو اپنی حسن کارکردگی کے باعث برصغیر میں مشہور ہوئے۔ چراغ حسن حسرت غزل تو خوب کہتے تھے۔ انکا تھوڑا ہی کلام ملتا ہے۔ غزل کے علاوہ وہ مزاحیہ شعر بھی

خوب کہتے تھے۔

ان کو مہتاب دین کہتے ہیں
سر پہ ہیں بال تین کہتے ہیں
میں پونچھ کی مسکان میں ہم رنگِ گدا ہوں
کیا شانِ الٰہی ہے کہ ٹٹّو پہ لدا ہوں

.....

۲۔ چودھری دیناناتھ رفیق

(دسمبر ۱۹۰۵ تا ۱۹۹۲ عیسوی)

پڑے افتاد جو سر پر اسے سہنا ہی پڑتا ہے
ستم کو سنگ دل اک دن ستم کہنا ہی پڑتا ہے

طبیعت جب نہ بھی چاہے بُری دنیا میں رہنے کی
مگر جب تک خدا کا حکم ہے رہنا ہی پڑتا ہے

چودھری دیناناتھ رفیقؔ

استاذ الاساتذہ، چودھری دیناناتھ کا تعلق موضع ہوتر، حویلی پونچھ شہر سے تھا۔ دیناناتھ رفیق بدری ناتھ پوری سگے بھائی تھے۔ پونچھ شہر کے قلب میں پوری بُک ہاؤس جو ایک قدیم، پرانی اور مشہور کتابوں کی دکان اسی خاندان کی ہے۔ دیناناتھ رفیقؔ بنیادی طور پر کشمیری اور اردو کے شاعر تھے۔ وہ پنجابی

بھی بخوبی جانتے تھے ۔ بقول سجاد پونچھی ،وہ پنجابی میں شعر بھی کہتے تھے ۔ پندرہ اگست ۱۹۹۲ء کو جب سجاد پونچھی گوجر ہاسٹل پونچھ کے وارڈن میں تھے تو انہوں نے پونچھ میں چودھری دینا ناتھ رفیق کے زیر صدارت ایک مشاعرہ کا انعقاد کیا افسوس چند ماہ بعد ہی رفیق اس دارِفانی سے چل بسے چودھری دینا ناتھ رفیق کا شعری مجموعہ ''سنبل وریحان'' مشہور ہے ۔

عبدلقادر سروری لکھتے ہیں:

''دینا ناتھ رفیق نے طویل نظموں کی شکل میں مختلف مشاہیر کی وفات پر مراثی لکھے ہیں ۔جن میں ''پنڈت جواہر لال نہرو،سردار ولبھ بھائی پٹیل ،سبھاش چندر بوس،لال بہادر شاستری'' قابل ذکر ہیں ۔ان میں انہوں نے ان مشاہیر کے انتقال پر قوم کو ہوئے نقصان کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی رنج وغم کا بھی ذکر کیا ہے ۔ان کی ایک طویل نظم ''شہید اعظم حضرت امام حسینؑ سے خطاب'' ایک بہترین مرثیہ سے تعبیر کی جاسکتی ہے ۔ یہ جموں کشمیر میں اب تک کا پہلا ایسا مرثیہ ہے جو مرثیہ کے اصلی ہیر وحضرت امام حسین کی شہادت پر لکھا گیا ہے ۔ چونکہ مرثیہ کے اصطلاحی معنی شہدائے کربلا کی شہادت پر رنج وغم کا اظہار کرنا ہی لیا گیا ہے ۔ کربلائی مراثی میں حضرت امام حسینؑ اور دیگر شہدائے کربلا کی شہادت اور اس سلسلے میں ان پر جو مصائب پڑے اور جس طریقہ سے انہوں نے مقابلہ کیا۔اس کا ذکر کیا جائے ۔ یہ مسدّس کی ہیت میں لکھا گیا،ایک طویل مرثیہ ہے ۔ملاحظہ فرمائیں ایک مسدّس کا بند ملاحظہ

فرمائیں:

اے حسین ابن علی سرّ شہیدانِ جہاں
اے عَلم بردارِ حُرّیت، انیس بے کساں

اے جری ہمّت، کماں دارِ سپاہِ قدسیاں
اے کرم فرمائے مِلت، چارۂ بے چار گاں

رہتی دنیا تک رہے گی یاد قربانی تری
تیغ کے سائے میں حق کی زمزمہ خوانی تری

(بحوالہ کشمیر میں اردو، عبدالقادر سروری)

ان کے شعری مجموعہ ''سُنبل وریحان'' میں ایک طویل نظم مرزا غالب کے خراجِ عقیدت میں لکھی گئی ہے۔اس میں غالبؔ کی عظمت کے ساتھ ساتھ ان کی موت کے کرب کا ذکر کیا گیا ہے۔''مرثیہ غالب''مثنوی کی ہیت میں لکھی گئی ان کی اہم نظم ہے۔ملاحظہ فرمائیں چند اشعار:

چاند بن کر جو ذکاوت کے فلک پر چمکا
تاج آسا جو سرِ علم وادب پر چمکا

نقش دنیا کے، زمانہ سے مٹا سکتا ہے کون
اور غالبؔ سے سخنور کو بُھلا سکتا ہے کون

عبدالقادر سروری نے چودھری دینا رفیق کو نظم و مرثیہ تک ہی محدود کر دیا حالانکہ آپ نے غزلیں بھی بہت کہیں ہیں قطعات بھی کہے ہیں ۔انکی مزاحیہ نظم موٹھی نامہ مشہور ہے ۔ایسے ہی مزاحیہ اشعار زبان زد عام ہیں ۔

جیب کی ڈِبیا چھن چھن باجے
ہم سے آنکھ ملائے کون

فیشن کا یہ عالم دیکھو
گھنگھٹ میں شرمائے کون

چودھری دینا رفیق کے غزلیں کلاسیکی رچاؤ کی حامل ہیں ۔لیکن ان میں بلا کی روانی ہے ۔چراغ حسن حسرت تو تین چار غزلوں کی وجہہ سے مشہور ہے بس یہی کچھ ان کا شعری سرمایہ ہے اور کچھ فکاہیہ نظموں کے ٹکڑے ۔حسرت کو شاعری کی فرصت ہی نہیں ملی اور البتہ صحافت میں بہت بڑا نام پیدا۔شاعری میں حسرت اور دین محمد تاثیر کی چشمک رہی ۔سچ یہی ہے کہ ڈاکٹر دین محمد تاثیر نے انہیں پنپنے نہیں دیا۔

○

یہ جس نے غم پہ غم ہم کو دیے ہیں
اسی کا نام لے لے کر جیے ہیں

ہمیں آزار کی بھائی ہے لذت
خوشی سے زہر کے پیالے پیے ہیں

نہ کھل جائے کسی پہ رازِ الفت
اسی خاطر یہ لب اپنے سیے ہیں

ہمیں معلوم ہے ایفا نہ ہوں گے
جو وعدے آپ نے ہم سے کیے ہیں

پتہ بھی ہے کہ کیا الزام ہیں وہ
جنونِ عشق میں جو سر لیے ہیں

بھروسہ کیجئے گا کیا کسی پر
یہاں جتنے بھی بہروپیے ہیں

چودھری دینا ناتھ رفیق

ایک اور غزل جو بسمل سعیدی (۱۹۰۱ تا ۱۹۷۷) کی مشہور زمانہ غزل (سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے) کی زمین میں کہی ہے اور بلا شبہ دینا ناتھ رفیق نے اس انقلابی اور پیامی نوعیت کی غزلیہ زمیں میں تغزل کے پھلکاریاں تراش کر اپنی استادی کا لوہا منوایا ہے۔

○

اتر کر دل کی گہرائی میں گھر کرنا بھی آتا ہے
حسینوں کو لہو سے ہاتھ تر کرنا بھی آتا ہے

بہانا اشک ہی شیوہ نہیں مہجور عاشق کا
اسے ہر اشکِ نمکیں کو گہر کرنا بھی آتا ہے

نہ مظلوموں کی آہوں کو سمجھ تُو نارسا ظالم
انہیں آہوں کو اپنی بااثر کرنا بھی آتا ہے

نگاہِ ناز سکتہ ہی نہیں کرتی فقط طاری
اسے ہر بزم کو زیر و زبر کرنا بھی آتا ہے

پری چہرہ، دلِ معصوم کو ہی لے نہیں اُڑتیں
انہیں ذی ہوش کو آشفتہ سر بھی کرنا آتا ہے

کسی کی یاد میں جو ہر سحر کو شام کرتے ہیں
انہیں ہر شامِ ہجراں کو سحر کرنا بھی آتا ہے

چودھری دینا ناتھ رفیق

.....

۳۔تحسین جعفری

۱۹۰۸ تا ۱۹۹۶ عیسوی

میں اور مدحِ خیرُ الانام اللہ اللہ
کہاں میں کہاں یہ مقام اللہ اللہ

تحسین جعفری ۱۹۰۸ عیسوی میں پونچھ کے منگناڑ گاؤں میں پیدا ہوئے۔اور افغان قبیلے یوسف زئی سے تعلق رکھتے تھے۔تحسین جعفری اعلیٰ پایہ کے عقیدتی شاعر تھے۔زندگی بھر مرثیے اور سلام ہی لکھے۔''سفینۂ نجات'' مجموعہ منظر عام پر آچکا ہے۔جس میں منظومات شامل ہیں۔شاعری میں مذہبی روایات سے پاؤں باہر نہیں رکھتے تھے۔ ۱۹۴۷ عیسوی میں ہجرت کر کے راولپنڈی جا بسے اسی سال انکے فرزند ارجمند ڈاکٹر مقصود جعفری کی ولادت ہوئی۔مقصود جعفری اعلی تعلیم یافتہ اور مشہور کتاب،سانگز آف ہیومینیٹی کے مصنف ہیں۔تحسین جعفری کشمیری،گوجری اور سرائیکی میں بھی اشعار کہتے تھے۔ انکی یہ حمد مشہور ہے۔

تری ذات پاک ہے اے خدا تری شان جلّ جلالہ ہُو
ترا نام خالق دوسرا تری شان جلّ جلالہ ہُو

تو رحیم ہے تو کریم ہے، تو علیم ہے تو عظیم ہے
تری ذات فہم سے ماورا،تری شان جلّ جلالہ ہُو

ہر دم تیرا خیال تیری جستجو رہے
سانسوں میں تُو بسے مری رگ رگ میں تُو رہے

تیرے سوا کسی کے نہ در پر جُھکے جبین
مقصود میرا تُو ہو تیری آرزو رہے

.....

آغاز بہاراں میں اپنا کچھ اور ہی عنواں ہوتا ہے
ہر زخمِ جگر لو دیتا ہے ہر داغ فروزاں ہوتا ہے

آنکھوں کے سونے جھروکوں میں اشکوں کی شمعیں جلتی ہیں
ہر شب مرے کلبۂ احزاں میں، اک جشنِ چراغاں ہوتا ہے

آئینِ محبّت میں واعظ احساس زیاں اور سود نہیں
جاتے ہیں اُسی کوچے میں، جہاں رسوائی کا ساماں ہوتا ہے

آسودۂ ساحل کیا جانے موجوں کی تلاطم خیزی کو
خود موجۂ ساحل ہیں ہم سے اندازۂ طوفاں ہوتا ہے

کس رشکِ گُل تر کی خوشبو میرے انفاس میں شامل ہے
ہر سانس کی آمَد و شُد جو احساس بہاراں ہوتا ہے

۴۔محمد اسماعیل ذبیح

۱۹۱۴ تا ۱۹۹۶ عیسوی

بدھل راجوری کے رہنے والے تھے ابتدائی تعلیم مدرسوں سے اور پھر اورینٹل کالج سری نگر سے حاصل کی۔ مزید لاہور سے عربی اردو میں اسناد حاصل کیں ۱۹۳۸ء میں بحیثیت استاد عربی تقرری ہوئی ۔مختلف ہائی اسکولوں میں عربی اردو پڑھاتے رہے ساتھ ساتھ سماجی اور سیاسی کاموں میں بھی مشغول رہے۔ ۱۹۴۷ عیسوی میں کوٹلی چلے گئے اور پھر وہاں سے ہزارہ منتقل ہو گئے ۔گوجری میں نالۂ دل اور یاد وطن اور انتظار مشہور تصانیف ہیں۔ اردو میں بلند پایہ کی شاعری کی ہے زبان کے معاملہ میں دینا ناتھ رفیق کے ہم پلّہ تھے۔

فطرت کو ناپسند ہے سختی زبان میں
رکھی نہ اسی لیے ہڈی زبان میں

محمد اسمعیل ذبیح، بحوالہ، خمانۂ جاوید ۲،ص ۸۵۳

ہم کو قاصد بھی ملا لکنت زدہ
ٹکڑے ٹکڑے کر دیے پیغام کے

محمد اسمعیل ذبیح

کشمیر میں اردو کے مصنف حبیب کیفوی نے اپنی مشہور کتاب ''کشمیر

میں اردو کے صفحہ ۳۲۴ پر آپ کا نمونہ کلام درج کیا ہے ۔اس میں شک نہیں محمد اسمعیل ذبیح اردو اور گوجر کے مستند شاعر تھے ۔محمد اسمعیل ذبیح ممتاز عالم دین تھے ۔وہ اپنے وقت کے اجل عالم اور بے نظیر مفتی بھی تھے ''قتلِ مرتد ''اور ''وراثتِ یتیم''جیسے مسائل کے حل نکالنے کا سہرا انہی کے سر ہے ۔

صبح خنداں کے لئے لازم سکوتِ شام ہے
اور نشاطِ دہر پابندِ غمِ ایام ہے

زندگی کہتے ہیں جس کو ہے وہ آغازِ ممات
موت کہتے ہیں جسے اک زندگی کی شام ہے

ہے جو انفاسِ مسلسل پر مدارِ زندگی
اعتبارِ زندگی پھر اک خیالِ خام ہے

اختلافِ ظرف سے مظروف میں ہے بیش وکم
فرق ساقی کا نہیں بادہ بقدرِ جام ہے

شرطِ اول دید کی ہے دیدۂ بینا ذبیح
وہ تو بیٹھے ہیں سرِ بام اور جلوہ عام ہے

○

کیا کروں جانِ جہاں تیرے سوا
ہے وبالِ جاں یہ جاں تیرے سوا

خاک یہ دل کا مکاں تیرے سوا
چھان ڈالا آسماں تیرے سوا

تو ہی اک ہے میری ساری کائنات
میں ہوں اک بے خانماں تیرے سوا

شام تیرے وصل کی ہے صبح ِ نور
صبح، شامِ بیکساں تیرے سوا

ننگِ سجدہ ہے تو ہے میری جبیں
کیا کوئی ہے آستاں تیرے سوا

محمد اسمعیل ذبیح

.....

۵۔ بلدیو راج رہبر پونچھی

۱۹۱۵ تا ۱۹۸۶ عیسوی

بلدیو راج رہبر نے شراب کے استعارے کے پردے میں سوزِ دروں،

جذبۂ عشق اور شعری شائستگی کا نہایت حسین اظہار کیا ہے۔ان کے اشعار دل کو چھو لینے کے ساتھ ساتھ قاری کو فکر و جذبے کے دریا میں غرق کر دیتے ہیں۔

کام کر جاتی ہے رہبر آگ پر یہ تیل کا
اور دل کی آگ بھڑکانے کو پی لیتا ہوں

ہم سے تو کرتے ہیں الفت مے سے نفرت ہے انہیں
کچھ نہیں بس ان کے تڑپانے کو پی لیتا ہوں

لگا کر اپنے ہونٹوں سے بھرم اسکا میں رکھ لوں گا
بھرا بھی گر نہ ہو خالی سہی اک جام آجائے

خرد کیا کام آتی ہے جنوں کیا ساتھ دیتا ہے
شکستِ زیست ہو کر جب دلِ ناکام آجائے

اچانک برق سی گرنے لگے سینے میں برچھی سی
وہ گُل اندام جب جلوہ نما بر بام آجائے

بلدیو راج رہبر

.....

۶۔محمد اسرائیل مہجور

۱۹۱۵ تا ۲۰۰۸ عیسوی

ذبیح کے چھوٹے بھائی محمد اسرائیل اثر مہجور اردو گوجری کے مستند شاعر تھے بدھل میں پیدا ہوئے مقامی مدرسوں سے تعلیم حاصل کی اور پھر لاہور سے سند بھی حاصل کی اور پیشہ سے استاد تھے نظمیں قطعات اور غزلیں بھی کہی ہیں۔ زندگی کے آخری ایام ایبٹ آباد میں گذارے اور وہیں ایک سڑک حادثہ میں جاں بحق ہوئے۔اور ایبٹ آباد میں مدفون ہیں۔

راہِ حیات میں ہیں مقاماتِ پُر خطر
کتنے ہی اپنے زادِ سفر کو لٹا گئے

وہ مائل جفا رہے ہم طالبِ وفا
مہجور اپنے فرض کو دونوں نبھا گئے

.....

جلوۂ حق کہاں نہیں ، جلوۂ حق ہے ہر جگہ
اپنی نگاہِ شوق کو وقفِ تلاشِ یار کر

قطعہ

دورِ انصاف اب بھی ہے غائب
ظلم کی صبح و شام آج بھی ہے

آدمیت کی اب بھی ہے تذلیل
ابن آدم غلام آج بھی ہے

محمد اسرائیل مہجور

مہجور کی سیاسی نظمیں مقصدیت کی حامل ہیں یہ حالی اسکول سے سخت متاثر تھے شعر وادب کو تعلیم کا ذریعہ سمجھتے تھے۔''یہی میرے وطن کی سرزمیں ہے''،نظم میں اپنے علاقہ کے بعض گاؤں کو پرو دیا ہے۔جس سے زبان و بیان کی قدرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

فرازِ درّہَ پنجال دیکھیں
وہ تھنّہ، شاہدرہ، درآل دیکھیں
وہ بدّھل آنس و بڑہال دیکھیں
وہ دیول گول اور مملال دیکھیں

یقیں ہوجائے گا جنت یہیں ہے
یہی میرے وطن کی سر زمیں ہے

ایک اور بند میں بھدروا کا ذکر کیا ہے۔

وہ بھدّرواہ کی زر خیز وادی
وہ ڈوڈا کی نشاط انگیز وادی
چَنہنی کی وہ راحت خیز وادی

نظیر اس کی نہ دنیا میں کہیں ہے
یہی میرے وطن کی سر زمیں ہے
محمد اسرائیل اثر

.....

۷۔ ٹھاکر پونچھی

۱۹۲۲ تا ۱۹۷۴

ٹھاکر پونچھی کا اصلی نام جگن ناتھ ٹھاکر تھا نے اردو افسانے اور ناول بھی لکھے ہیں ترقی پسند تحریک سے متأثر تھے ان کے مشہور افسانوی مجموعوں کے نام نیچے دیے گئے ہیں۔ ان کے بعض افسانوی مجموعے بیسویں صدی کے تعاون سے منظر عام پر آئے۔

اداس تنہائیاں مطبوعہ ۱۹۶۰ء
رات کا گھونگھٹ
وادیاں اور ویرانے
شمع جلتی ہے ہر رنگ میں سحر ہونے تک
یادوں کے کھنڈر (ناشر بیسویں) صدی
چاندنی کے سائے (ناشر بیسویں صدی)
اب میں وہاں نہیں رہتا

ڈیڈی (رنگین ناول)

قفس اداس ہے (ناول)

پیاسے بادل (ناول)

.....

۸۔ گرداری لعل برق

۱۹۲۴ تا ۱۹۸۶ عیسوی

برق بنیادی طور پر موضع ہوتر حویلی پونچھ کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۴۷ عیسوی کے خاص پونچھ میں منتقل ہوئے۔ ۱۹۶۰ کے بعد پونچھ کے بعد ادبی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ بیشک ان بزرگ اساتذہ نے اردو زبان کی خدمت کی۔ دینا ناتھ رفیق، سرون ناتھ آفتاب، بلدیو راج رہبر قدیم، اور گرد لعل برق، پونچھ کی ادبی محفلوں کی شان تھے۔ انہی حضرت کی صحبت میں رہ کر حسام الدین بیتاب، محمد الدین بانڈے، کیول کرشن کپور، محمد نظیر قریشی، نذیر حسین قریشی، سجاد پونچھی، کے ڈی مینی، شعراء اور ادباء نے تربیت پائی۔ راجوری میں چونی لعل شعلہ، شہباز راجوروی نے بھی اردو کے فروغ کے لئے کوشش کی۔ گرداری لعل برق نے دینا ناتھ رفیق اور سرون ناتھ آفتاب سے اصلاح لی اور غزلیں نظمیں قطعات خوب کہے۔ بدقسمتی سے زیادہ تر کلام دست برد زمانہ کی نذر ہوگیا۔ حسام الدین بیتاب ہمارے استاد تھے وقتاً فوقتاً ہم سے ان اساتذہ کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ بقول عبدالقادر سروری"

برق کو شعر گوئی کا چسکا اوائل عمر سے تھا جو نامساعد حالات میں بھی جاری رہا۔غزل قطعہ اور نظم تینوں اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔بحوالہ کشمیر میں اردو ادب، جلد سوم،ص ۷۱ / ۷۲

نمونۂ کلام:

بشر نے سینکڑوں ساماں کیے ہیں زیست کی خاطر
مرے کانوں میں چُپکے سے فضا کچھ اور کہتی ہے

یہ مانا دیدۂ تر سے رواں ہے پیار کے آنسو
ترے رنگین ہاتھوں کی حنا کچھ اور کہتی ہے

ہٹادوں چاند سے رُخ سے سیہ زلفوں کی بدلی کو
مگر اے برق نظروں سے حیا کچھ اور کہتی ہے

گرداری لعل برق

.....

۹۔مالک رام آنند

۱۹۲۵ تا ۲۰۰۴ عیسوی

مالک رام آنند (المتوفی ۲۰۰۴) اور پروفیسر مالک رام (غالب شناس المتوفی ۱۹۹۳ عیسوی) دو الگ شخصیتیں ہیں مالک رام آنند کا تعلق بھی غیر منقسم پونچھ تھا ۱۹۴۷ عیسوی میں مہاجرت کے بعد جموں پیر مٹھا جموں میں

مقیم ہو گئے ۱۹۹۰ کے ادب جموں میں ادبی سرگرمیوں میں پیش پیش رہے۔ ۲۰۰۳ تک دانشکدہ میں مسلسل آتے رہے بلند پایہ کے افسانہ نگار تھے شاعری بھی کرتے تھے۔ مالک رام آنند کے مشہور افسانوی مجموعے یہ ہیں۔

نئے خدا

دہکتے پھول، شبنم آنکھیں

صلیب اور دیوتا

اپنے وطن میں اجنبی

نئے دن پرانے سال (ناولٹ)

دہکتے پھول شبنم آنکھیں ۱۹۶۴ عیسوی ایس این پبلیشرز نے شایع کیا۔ ۱۶۴ صفحات پر مشتمل اور یہ نسخہ The University of Michigan کے پاس محفوظ ہے۔

.....

۱۰۔ حسام الدین بیتاب

۱۹۳۰ تا ۲۰۲۰ عیسوی

حسام الدین بیتاب سرنکوٹ کے رہنے والے تھے اور ۱۹۴۷ عیسوی کے بعد اردو شاعری شروع کی۔ بیتاب ایک حساس اور بیدار دماغ شخصیت کے مالک تھے۔ سماجی اصلاح میں لگے رہتے تھے۔ خوش خُلق اور ہمدرد

انسان تھے ۔ انکے دو شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں ۔ انکی شاعری پر جموں یونیورسٹی سے محترمہ گل اکثر نے ایم فل بھی کی ہے ۔ دامن شب شعری مجموعہ ۲۰۰۷ عیسوی میں منظر عام پر آیا ۔ اسکے بعد فلاحی مضامین لکھتے رہے ۔ انکے دو شعر بہت مشہور ہیں ۔

ڈوبتے دیکھا ہے اس کو روز میں نے دوستو!
اس لئے پوجا نہیں سورج کو چڑھتا دیکھ کر

کاٹنے دوڑے ہیں سارے شہر کے کُتّے مجھے
ہاتھ خالی، شب گزیدہ اور تنہا دیکھ کر

حسام الدین بیتاب

.....

۱۱۔ محمود الحسن محمود

۱۹۳۷ تا ۲۰۱۸ عیسوی

مسعود الحسن مسعود اور محمود الحسن محمود، دونوں سگّے بھائی تھے اور چراغ حسن حسرت کے بھانجے تھے ۔ پونچھ میں ادبی سرگرمیوں روح رواں رہے ۔ مسعود الحسن مسعود جلد ہی رخصت ہو گئے ۔ البتہ محمود الحسن محمود نے لمبی عمر پائی ۔ کلاسیکی طرز کے عمدہ شاعر تھے ۔ انکا ایک شعر مشہور رہے ۔

عقیدت کی دلیل اک ہم بھی اپنی پیش کرتے ہیں
خدا کس کام کا جب کام سب درویش کرتے ہیں

.....

اوج پر فکر مبیں ہو تو غزل ہوتی ہے
موجزن دل میں یقیں ہوتو غزل ہوتی ہے

روبرو پردہ نشیں ہو تو غزل ہوتی ہے
دل کو تسکین کہیں ہو تو غزل ہوتی ہے

شعر ہوتا ہے رقم خونِ جگر سے لیکن
ذوق شاعر کا حسیں ہو تو غزل ہوتی ہے

محض الفاظ سے ہوتی نہیں تخلیق اس کی
عشق بھی دل میں مکیں ہوتو غزل ہوتی ہے

شعر گوئی پہ جنہیں ناز ہے اتنا سن لیں
میر و غالب کی زمیں ہو تو غزل ہوتی ہے

.....

سینے میں حادثوں کو سپر کر لیا کرو
یہ کام ہے کٹھن سا مگر کر لیا کرو

جن پر ہو مشکلات کے سائے پڑے ہوئے
ان منزلوں میں عزمِ سفر کرلیا کرو

غیروں پہ نکتہ چینیاں کرنے سے پیشتر
اپنی قباحتوں پہ نظر کرلیا کرو

اے گلشن حیات کے پھولوں کے عاشقو
کانٹوں میں بھی کچھ وقت بسر کرلیا کرو

''فکرِ معاش'' اور غمِ زندگی کے ساتھ
ذکرِ خدا بھی شام و سحر کر لیا کرو

.....

۱۲۔ مسعود الحسن مسعود

۱۹۴۰ تا ۱۹۹۶ء

محمود الحسن محمودؔ کے چھوٹے بھائی تھے، مسعود الحسن مسعود خاص پونچھ شہر میں رہتے تھے۔ رند اور لا ابالی شخصیت کے مالک تھے۔ مسعود الحسن مسعود مذہبی رواداری اور آزاد روی کے علمبردار (nonconformist) تھے۔ لہذا پونچھ بازار میں ہر طبقہ کے لوگ انکی آؤ بھگت کرتے تھے۔ مولوی نامہ نظم مشہور ہے۔

سُن ذرا اے ناخدائے مولوی
مولوی نامہ برائے مولوی

خدائے سخن غالب کی زمیں میں ایک غزل کے دو اشعار:

اردو زباں پھر تجھے ملنے کے ہم نہیں
ہم ہیں تیرا فروغِ ساماں کیے ہوئے

مسجد کی کھڑکیوں سے خدا جھانکنے لگا
مُسلم کہاں ہیں گھر مرا ویراں کیے ہوئے

.....

دل کو سکون ہے نہ خوشی ہے ترے بغیر
محفل تمام سونی پڑی ہے ترے بغیر

گلشن کے دلفریب مناظر پہ ان دنوں
اِک مُردنی سی چھائی ہوئی ہے ترے بغیر

مرجائیے کہ چار گھڑی اور دیکھئے
اب زندگی یہ سوچ رہی ہے ترے بغیر

تو ہی نہیں جو جشنِ بہاراں کو کیا کروں
ہر اک خوشی میں طُرفہ کمی ہے ترے بغیر

آجائیے کہ جان سے جانے لگے ہیں ہم
نبضِ حیات آج رُکی ہے ترے بغیر

.....

ہماری ہر سعی ناکام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
کسی پر پے بہ پے انعام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

کسی کے سامنے آغاز ہی آغاز ہے لیکن
ہمارے سامنے انجام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

بغیر اس کی رضا کے گر کوئی پتّہ نہیں ہلتا
بشر پھر موردِ الزام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

ادھر جذبِ محبت کی فراوانی کا یہ عالم
اُدھر الفت برائے نام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

سراپا جرم ہیں پھر بھی خدا سے ڈرنے والوں میں
سرِ فہرست اپنا نام کیوں ہے ہم نہیں جانتے

۱۳۔غلام نبی شہباز راجوروی

۱۹۴۰ تا ۲۰۲۱ عیسوی

شہباز راجوروی نہ صرف کشمیری کے بلند پایہ کے شاعر تھے بلکہ اردو اور گوجری میں بھی خوبصورت غزلیں کہی ہیں۔کشمیری شعری مجموعہ طواف، کے علاوہ ''انداز نظر'' مضامین بھی لکھے۔کشمیری میں انعام یافتہ شاعر تھے۔نمونہ کلام:

اذاں کے بعد دعا کو جو ہاتھ اٹھائے وہ
امام اپنی نمازیں بھی بھول جاؤں میں

نہ اکتسابِ نور ہے اندھے کے بس کی بات
گرچہ تمام رات ہو آنگن میں آفتاب

شہباز راجوروی

.....

۱۴۔فدا راجوروی

۱۹۴۱تا۲۰۲۰عیسوی

ہمارے جھونپڑے اکثر جلا کر وہ یہ کہتے ہیں
کہ آدابِ جہاں بانی میں ایسا ہوتا رہتا ہے

فدا راجوروی

عبدالرشید فدا موضع پوشانہ سرنکوٹ میں پیدا ہوئے۔پتھر پتھر آئینہ ۲۰۱۱ء اور شہرِ دل (اردو کشمیری پہاڑی اور گوجری)،کشمیری میں کل ملا کر تیرہ کتابوں کے مصنف و مولّف ہیں۔مزید دو غیر مطبوعہ شعری مجموعے، شش جہات اور قلم برداشتہ،مسودے میری نظر سے گذرے ہیں۔

فردِ عصیاں میری دُھل گئی خود بخود
میں جو لایا گیا رو بروئے نبی

اخلاص کی زمین پہ جب ہو نہ استوار
ہر شاخ نامراد ہے نخل مُراد کی

ہوا کی برہمی ہے اور میں ہوں
بجھی ہر روشنی ہے اور میں ہوں

کہاں اس شہرِ شر سے بچ کے جاؤں
سیاست پروری ہے اور میں ہوں

فدا راجوروی

.....

۱۵۔راج کمار چندنؔ

۱۹۴۵ء

راج کمار چندن کا تعلق کانگڑی سندر بنی سے ہے انکی پیدائش موضع سیری کوٹلی میں ہوئی لیکن ۱۹۴۷ میں نقل مکانی کر کے سندر بنی میں رہائش پذیر ہو گئے چندن نے ہائی اسکول سندر بنی (راجوری) سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔جوانی میں سیر و سیاحت کی ممبئی اور دیگر شہروں میں گھومے پھرے بالآخر جموں بخشی نگر میں مقیم ہو گئے۔جموں یونیورسٹی سے ایم اے/ ایم فل اردو میں سند لی۔۔گیان چند جین اور جگن ناتھ آزاد سے تعلقات برقرار رہے،یہ الگ بات ہے کہ ان کا جموں یونیورسٹی میں بطور استاذ تقرری کا خواب، سفارشی

حضرات نے پورا نہیں ہونے دیا۔ چندن نے زندگی میں بہت دکھ اٹھائے یہ دکھوں کا سلسلہ موضع سیری کوٹلی سے دو تین سال کی عمر میں شروع ہوا تھا جب وہ اپنے کنبہ کے افراد کے ساتھ اسباب بسر ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔ کہتے ہیں زخم رسیدہ جگہ پر ہی زخم لگتے رہتے ہیں ۱۹۴۷ عیسوی کے بعد چندن بدسلوکی و بے اعتنائی کا ہدف بنتے رہے۔ بقول میر

منعم کے پاس قاقم و سنجاب تھا تو کیا
اس رند کی بھی رات کٹی جو کہ عور تھا

پچھلے کچھ عرصہ سے جموں وکشمیر کے اردو شعرا کا (بحوالہ غزل) مطالعہ کر رہا ہوں۔ شاید ریاستی سطح پر اکثر شعرا اور ادبا، جموں میں عرش صہبائی اور پرتپال سنگھ کا نام ہی جانتے ہوں یا پھر عابد مناوری اور ودیارتن عاصی کو۔ لیکن یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جموں میں طالب ایمن آبادی کے علاوہ راج کمار چندن بھی اردو ہندی اور ڈوگری کے منفرد لہجہ کے عمدہ شاعر ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ موصوف ۱۹۸۳ عیسوی کے بعد لگاتار العطش اردو رسالہ نکالتے آئے ہیں۔ العطش کے کئی شمارے کافی اہمیت کے حامل ہیں مثلاً جگن ناتھ نمبر ایک حوالہ کی کتاب بن چکا ہے۔

چندن کی نیچے دی گی غزل میں اسی کرب کی عکاسی ہوئی ہے۔ بے شک چندن کا یہ ہموار جامع، اور درد انگیز کلام پڑھ کر حساس قاری کی آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں۔ اشعار

راحتوں کی تمام راتوں پر
درد کی ایک رات بھاری ہے

آج کی رات اگر گذر جائے
میں یہ سمجھوں صدی گذاری ہے

.....

آپ کی شہرت بڑھانے کے لئے
میں زمیں میں کس قدر گڑتا گیا

.....

جو سمجھتا ہے کہ منزل ہے قریب
اس کو تو کرنا ہے آغازِ سفر

○

ہے نزولِ ناتوانی اور بھی
جاں کنی اور جاں فشانی اور بھی

زلزلہ کافی نہ تھا ان کے لئے
ہیں بلائیں آسمانی اور بھی

آمدن کو کیا بڑھائیں گے میری
ہاں بڑھائیں گے گرانی اور بھی

دوسروں کے ہوگئے دستِ نگر
چاہیے تھی کامرانی اور بھی

چارجانب پھیلتا ہی جائے گا
سکّۂ ہندوستانی اور بھی

○

مجھ سے ناراض روشنی میری
اس پہ تاریک راہ بھی میری

وہی گاڑی نہ مل سکی مجھ کو
جو تھی آخری امید میری

پار کیسے ہو رستۂ اظہار
کھو گئی لفظ کی چھڑی میری

اب تو میں پھڑ پھڑا ہی سکتا ہوں
مجھ سے پرواز چھن گئی میری

ایک اظہار مل گیا چندن

ایک تخلیق کھو گئی میری

○

سمندر اس لئے حیران سا ہے
کہیں اس کا جزیرہ کھو گیا ہے

یہاں ہر شب ستارے ٹوٹتے ہیں
یہ منظر آج شب کوئی نیا ہے

اُسے ملنا ہے آخر اس زمیں سے
نجانے کیوں ہوا میں اڑ رہا ہے

ہمارے شہر کا دستورِ اعلیٰ
اندھیرے میں کہیں لکھا ہُوا ہے

ہمیشہ حادثوں کا منتظر ہے
سیہ راتوں میں کوئی جاگتا ہے

نہیں شہتوت کے پتّے ، نہ "کھپٹی"
کوئی ریشم کا کیڑا سوچتا ہے

راجکمار چندن

.....

۱۶۔خورشید بسمل

۱۹۴۷ عیسوی

تھنہ منڈی راجوروی سے تعلق رکھتے ہیں۔ پونچھ راجوری کے کہنہ مشق شعرا میں سے ہیں ۔شعری مجموعہ ''ابر نیساں'' منظر عام پر آچکا ہے۔ محامِد ،نعوت قطعات کے علاوہ غزلیں کہتے ہیں۔الفاظ وخیالات کلاسیکی ادب سے ہی مستعار لیتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ خورشید بسمل کی بعض شاعری میں عقیدت کی بو باس رچی بسی ہوئی ہےاور اثر آفرینی سے مالامال ہے۔

عشق و وفا کے تذکرے پارینہ داستان
صحرا رہے نہ قیس ہی، شیریں نہ کوہکن

چہروں کے رنگ روپ پہ بسمل نہ جائیو!
جل بھن چکے ہیں ہی اندر سے گُل بدن

○

عجب انداز سے آئینہ دکھایا کس نے
روبرو آج مجھے خود سے کرایا کس نے

پہلے رعنائیِ گلشن سے مجھے باز رکھا
اور پھر قعرِ مذلّت میں گرایا کس نے

مجھے گمنام سی منزل کا پتہ کس نے دیا
ایک انجان سے رستے پہ چلایا کس نے

میں تو آزاد فضاؤں کا پلا طائر تھا
مجھ کو انفاس کے زنداں میں بٹھایا کس نے

نخل امّید ہرا رکّھا ہے میرا بسملؔ
روز خوابوں میں نیا خواب دکھایا کس نے

خورشید بسمل

.....

۱۷۔شیخ سجاد پونچھی

۱۹۴۶تا۲۰۲۳عیسوی

شیخ سجاد کا تعلق پونچھ خاص شہر سے ہے۔جیوگرافی کے لکچرار رہے پھر گوجر ہاسٹل پونچھ کے وارڈن اور بطور پرنسپل ریٹائر ہوئے۔اردو،گوجری اور پہاڑی کے قلمکار تھے۔ شیخ سجاد پونچھی نے پونچھ کے ادبی حلقوں کو نئی تاب وتوانائی عطا کی اور نوجوانوں میں ادبی شعور اُجاگر کرنے کا اُن اہم رول ہے۔اردو میں دو شعری مجموعے،فصیلیں بولتی ہیں اور سمندر آشنا شایع ہو

چکے ہیں۔

نمونہ کلام:

زمیں سے رشتہ بھی اُن کا بہت ہی گہرا تھا
وہ آسماں کی بلندی میں گھر بناتے رہے

لگتا ہے بدل جائے گی حالات کی صورت
میں وقت کے ماتھے پہ بل دیکھ رہا ہوں

عجب گھٹن ہے نحوست ہے مفلسی ہے مگر
حسین چاند بھی ان جھونپڑوں میں پلتے ہیں

غمِ حیات کی تفسیر اس میں رہنے دو
یہ گھر ہے زخموں کا ہر تیر اس میں رہنے دو

ازل سے عشق تو اس کی جفا کاری کا عادی ہے
یہ جور و کرب کی شمشیر اس میں رہنے دو

شیخ سجاد پونچھی

.....

۱۸۔خوشدیو مینی

۱۹۴۷عیسوی

خوش دیو مینی المعروف کے ڈی مینی ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں ۔ جو بیک وقت ادیب،صحافی، شاعر، محقق افسانہ نگار اور مورخ ہیں ۔ پونچھ راجوری بلکہ ریاست کے پرانی تاریخ تمدن پر گہری نظر رکھتے ہیں ۔صوفیوں صافیوں کی تعلیمات کے مبلغ ہیں ۔سیاسی مذاکرے، سیر یلز بھی لکھے ہیں ۔صوبہ جموں کی تمدنی تاریخ ،انگریزی میں پیر پنجال ریجن، پونچھ دی بیٹل فیلڈ مشہور کتابیں ہیں ۔انکی ۲۱ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں ۔'' یاد ہے تم کو'' مجموعہ میں انکی اردو، پہاڑی اور گوجری بھی نظر سے گذری ہے ۔نمونہ کلام/غزل

وقت سے ٹوٹ کے اس راہ سے گذرا سورج
میں نے پھر رات کی گہرائی میں دیکھا سورج

خون کا رنگ سرِ افق تھا پھیلا پھیلا
ہائے اک زخم تھا وہ شام کا ڈھلنا سورج

ساتھ موسم کے شعاؤں کی حرارت بھی گئی
کس نے سوچا تھا بدل جائے گا جلتا سورج

تشنگی اور جلن جسم کی ایسے تو نہیں
میرے اندر ہے سوا نیزے پہ اُترا سورج

تابِ نظارہ تو اک خواب ہے دیوانے کا
کس نے دیکھا ہے کھلی آنکھ نکلتا سورج

کے ڈی مینی

.....

۱۹۔ ڈاکٹر صابر مرزا

۱۹۴۷ تا ۱۹۱۷ عیسوی

ڈاکٹر صابر حسین مرزا المعروف صابر مرزا، بھروٹ تھنہ منڈی کے رہنے والے تھے عمر نے وفا نہ کی ریٹائرمنٹ کے بعد جلد ہی وفات پا گئے۔ پہاڑی گوجری اور اردو میں خوب شعر کہتے تھے۔ وفات سے تھوڑا عرصہ پہلے ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ پہاڑی میں "باغ بہاراں" "رنگ رُتاں گلزار" مجموعوں کے علاوہ "خوشبو نما" اور حدِ فراز منظر عام پر آچکے ہیں۔ بعض اشعار:

آئینہ ،برف کا گھر ،ریت سلگتے صحرا
رُت کے جسموں پہ رکھی شوخ شرر ہو شاید

وسعتیں، رنگ، صدا درد، جھلستے موسم
ایسا لگتا ہے کہ وا کرب کا در ہو شاید

حسن و جمال کے وہ سائے نہیں رہے
جب سے تمہاری یاد کے سائے نہیں رہے

یادیں پکارتی ہیں کسی دلنواز کی
کیوں اب کسی سے درد کے رشتے نہیں رہے

اترے گی کیسے گھر میں ہمارے وہ چاند رات
صابر وہ بام و در وہ دریچے نہیں رہے
صابر مرزا

.....

۲۰۔بشیر بھٹ

۱۹۴۸ تا ۲۰۰۹ عیسوی

بشیر بھٹ کا تعلق خاص تحصیل منڈی پونچھ سے تھا۔اردو کے لکچرار تھے اور اپنے علاقہ کے نمائیندہ اردو شاعر تھے۔خطابت و نظامت میں یگانہ روزگار تھے۔مرحوم اسلامی و ملی جذبہ سے سرشار تھے۔غزلیہ اشعار وفورِ شوق سے لبریز معلوم ہوتے ہیں۔

پہلے وقتوں میں رسالے تصاویر کی وجہ سے بکتے تھے اور اخباریں لیتھو پرنٹ میں کھردرے کاغذوں پر چھپتی تھی۔ان اخباروں کو لوگ کم ہی خریدتے

تھے۔اسی زمانے کے مشاہدے کو شاعر نے بہت ہی خوبصورت اشعار میں ڈھالا ہے:

تصویر کوئی جاذبِ قلب و نظر نہیں
اخبار کیا بکے گا رسالوں کے شہر میں

معقول دام پر یہاں بِک سکتے ہیں ضمیر
چسپاں ہیں اشتہار دلالوں کے شہر میں

بعض اشعار

حکمرانی جنوں کی جہاں ہو وہاں
دانش علم و فکر و نظر کیا کرے

سب سے بہتر یہی ہے سب مل کر
قوم کی بہتری کی بات کریں

بشیر بھٹ

.....

۲۱۔بلراج بخشی

۱۹۴۹تا۲۰۲۴عیسوی

ذرا سی چھاؤں نے یہ شرط رکھ دی
کہ دھوپ آئے تو جلنا بھی ہے مجھ کو

کسی نے کھینچ لی سیڑھی تو گر کے ٹوٹ گیا
میں سخت جان کہاں ایسے مرنے والا تھا

تمام شہر میں اعلان کر دیا تم نے
میں قرض لے کے بھلا کب مُکر نے والا تھا

قدم قدم پہ سہارے کا کر دیا محتاج
اگر نہ تھامتا کوئی تو میں سنبھل جاتا

بلراج بخشی

بلراج بخشی کے والدین کا تعلق تحصیل حویلی پونچھ کے گاؤں پھگولی سے تھا جو ۱۹۴۷ میں مہاجرت کے بعد رفیوجی کیمپ نگروٹہ میں آ گئے۔ بلراج بخشی وہیں پیدا ہوئے۔ وہاں سے بٹوت گئے پھر ادھم پور کے ہی ہو کر رہ گئے۔ بنیادی طور پر پونچھی ہیں۔ لہذا ان کا ذکر پونچھ راجوری کے شعرا میں کیا ہے۔ ہمارے نزدیک وہ اب بھی خطۂ پیر پنجال یعنی پونچھ راجوری کے معتبر شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔

پیر پنجال سے نکال دیا
اب تَوی کا ہوں یا چناب کا میں

بلراج بخشی

بلراج بخشی بہت اچھے افسانہ نگار اور شاعر بھی ہیں ۔خوبصورت غزلیں اور نظمیں کہی ہیں ۔ایک بوند زندگی (افسانوی مجموعہ) اور مٹی کے موسم (شعری مجموعہ)۲۰۲۱ میں منظر عام پر آچکا ہے جس میں ۱۲۲ غزلیں اور زاید از بیس نظمیں شامل ہیں ۔آنسوؤں سے متعلق انکا شعر مشہور ہے ۔

جیسے پلکوں کنارے پہ ٹکے رہتے ہوں
ڈھونڈ لیتے ہیں نکلنے کا بہانہ کوئی

بلراج بخشی اپنے کلام میں سماج میں آنے والی تبدیلیوں اور اخلاقی قدروں کی پامالی کا بھرپور ذکر کیا ہے ۔بلراج بخشی نے عوام کے درد کو اپنا درد سمجھا ہے ۔انکی بہت سی غزلیں زبان و بیان کے عمدہ نمونے ہوسکتی ہیں ۔وہ مہمل یا مبہم اشعار نہیں کہتے انکے اشعار حکمت و دانش سے لبریز معلوم ہوتے ہیں ۔ زبان کی شائستگی اور خیالات کی پاکیزگی انکا طرۂ امتیاز ہے ۔بعض منتخب اشعار :

حادثے اور بھی ہیں شہر میں ہونے والا
آنسوؤں کی نہ کمی ہو کہیں رونے والے

.....

ایسی تہذیب نظر آنے لگی بچّوں میں
نظر آتے نہیں گلیوں میں کھلونے والے

میں خدّو خال اپنے کھو رہا ہوں
کہ شاید کچھ نیا سا ہو رہا ہوں

.....

وہی حالات ہیں لیکن میں اب مضطر نہیں ہوتا
کسی مچھلی کو جیسے ڈوبنے کا خطرہ نہیں ہوتا

کہیں آدھار، ووٹر آئی ڈی ہے، سی سی ٹی وی ہے
کہ یعنی اب کوئی راڈار کے باہر نہیں ہوتا

جیسے مِری شکست میں اس کا بھی ہاتھ ہے
جب بھی وہ ملے آنکھ چُراتا ہُوا ملے

.....

○

سڑک کے بیچ چلنا بھی ہے مجھ کو
مگر بچ کر نکلنا بھی ہے مجھ کو

پگھلنا ہی مِرا کافی نہیں ہے
کسی صورت میں ڈھلنا بھی ہے مجھ کو

ذرا سی چھاؤں نے یہ شرط رکھ دی
کہ دھوپ آئے تو جلنا بھی ہے مجھ کو

طبیعت اس لئے ضدّی نہیں ہے
وہ جب چاہے بدلنا بھی ہے مجھ کو

بہکنے کی طلب جس وقت ہوگی
اسی لمحہ سنبھلنا بھی ہے مجھ کو

رُکا ہوں اس لئے بلراج پیچھے
ابھی آگے نکلنا بھی ہے مجھ کو

.....

○

نہ جانے کون تھا اور کیا وہ کرنے والا تھا
مِرے قریب سے چُھپ کر گزرنے والا تھا

کسی نے کھینچ لی سیڑھی تو گر کے ٹوٹ گیا
میں سخت جان کہاں ایسے مرنے والا تھا

تمام شہر میں اعلان کردیا تم نے
میں قرض لے کے بھلا کب مُکرنے والا تھا

.....

کہیں بھی زندگی اپنی گزار سکتا تھا
وہ چاہتا تو میں دانستہ ہار سکتا تھا

زمین پاؤں سے میرے لپٹ گئی ورنہ
میں آسمان سے تارے اتار سکتا تھا

جلا رہی ہیں جسے تیز دھوپ کی نظریں
وہ ابر باغ کی قسمت سنوار سکتا تھا

عجیب معجزہ کاری تھی اس کی باتوں میں
کہ وہ یقیں کے جزیرے ابھار سکتا تھا

مرے مکان میں دیوار ہے نہ دروازہ
مجھے تو کوئی بھی گھر سے پکار سکتا تھا

پر اطمینان تھیں اس کی رفاقتیں بلراجؔ
وہ آئنہ میں مجھے بھی اتار سکتا تھا

.....

کھڑے کھڑے کفِ افسوس کوئی مل جاتا
رُکا پڑا کوئی آنسو ہوں نکل جاتا

بچھڑنا اپنا مقدّر ازل سے ہے لیکن
یہ سانحہ کسی اگلی گھڑی کو ٹل جاتا

قدم قدم پہ سہارے کا کردیا محتاج
اگر نہ تھامتا کوئی تو میں سنبھل جاتا

مِرا عروج و زوال ایک کشمکش ہی رہا
زمین کھاتی کبھی آسمان نگل جاتا

کہاں کسی کو ضرورت میری رہی بلراج
کسی بھی شکل میں کوئی چاہتا میں ڈھل جاتا

بلراج بخشی

.....

۲۲۔ پرتپال سنگھ بیتاب

۱۹۴۹ عیسوی

تیشہ چُپ ہے خاموش آذر
پتھر میں بے چین ہے پیکر

غلام ہوتے اگر خواہشوں کے اچھا تھا
پکڑ کے چھوڑی ہیں سو بار تتلیاں ہم نے

پرتپال سنگھ بیتاب اردو کے مشہور شاعر ہیں ۔ بنیادی طور پر پونچھ کے کھڑی گاؤں سے ہیں ۔ پرتپال سنگھ بیتاب کی شاعری پونچھ کی ملی جلی تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں ۔ داغ اسکول سے متاثر ہیں ۔ غزل کے علاوہ نظم بھی کہتے ہیں ۔ پرتپال سنگھ بیتاب کے سات شعری مجموعے ایک جزیرہ بیچ سمندر، پیش خیمہ، خود رنگ، سراب در سراب، فلک آثار، موجِ ریگ اور نظم اکیسویں صدی منظر عام پر آچکے ہیں ۔ صوبہ جموں میں پرتپال سنگھ اردو غزل کے مستند حوالہ کی حیثیت رکھتے ہیں ۔

اونچا پہاڑ چڑھ کے اترنا پڑا اسے
جینے کا وقت آیا تو مرنا پڑا اسے

جانتا ہوں مجھے مروائے گا اک دن یہ مرا
دیر کو کعبہ تو کعبے کو کلیسا کہنا

پگڈنڈیوں کے جال نے الجھا دیا ہمیں
وہ راستے کہاں گئے جو مستقیم تھے

کچھ تو ہیں پیکر پریشاں آذروں کے درمیاں
اور کچھ آزر پریشاں پتھروں کے درمیاں

.....

تیرے نیزے کی بدولت اے دوست
دیکھ اونچا ہے مرا سر کتنا

وسعتیں راستوں میں آنکھیں بچھائے کھڑی ہیں
ذات کے خول سے باہر تو نکل کر دیکھو

برف موسم کے پرندے ہو تمہیں کیا معلوم
کبھی ققنوس کی مانند جل کر بھی دیکھو

موتیوں تک ہم پہنچ پائے نہیں
ساحلوں پر سیپیاں چنتے رہے

ایک جزیرہ بیچ سمندر کے، پرتپال سنگھ بیتاب کا ساتواں شعری مجموعہ ہے. بیتاب نے غزل میں اردو اور ہندی زبان کے بیچ کی راہ اختیار کی ہے ان سات مجموعوں میں ''نظم اکیسویں صدی'' بھی شامل ہے۔ پرتپال سنگھ بیتاب کی شاعری کے ابعاد و حدود اور طول و عرض ڈھکے چھپے نہیں ان کے اشعار میں کہیں دانش و ہنر کے موتی پروئے ہوئے ملتے ہیں تو کہیں وہ طنز و مزاح کے ہلکے ہلکے چپت لگاتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ایسا کرتے وقت وہ زہرناکی و تلخی کا احساس نہیں ہونے دیتے۔

چار کتابیں پڑھ کر دانشور بن جاتے ہیں
ہم جو بہتے پانی میں پتھر بن جاتے ہیں

نہایت کی خوبصورت شعر ہے. بہتے پانی میں پتھر بننے کی ترکیب کا جواب نہیں. یہ نہایت بلیغ شعر ہے۔میرے خیال میں یہ کوئی کم اعزاز نہیں کہ اس عہد میں کسی کا شعر پڑھ کر کسی بڑے شاعر کی یاد تازہ ہو جائے .. بقول سعدی:

علم چندان کہ بیشتر خوانی
چون عمل در تو نیست نادانی

نہ محقق بود نہ دانشمند
چارپایی بر او کتابی چند
آن تہی مغز را چہ علم و خبر
کہ بر او ہیزم است یا دفتر

ترجمہ:

چار پائے پر کتابیں لادنے سے نہ تو محقق بن جاتا ہے نہ دانشمند۔اس تہی مغز کو کیا خبر کہ اس پر کتابوں کا دفتر لدا ہوا ہے یا جلانے کی لکڑی ۔گنجے کو گنجا کہو تو بال نوچنے کو آتا ہے اسی لئے دانشمند لوگ گنجے کو گنجا نہیں کہتے ..اسی سے ملتے جلتے خیال میں ایک شعر

اپنے رستے میں بھلا کس لئے بونا کانٹے
کیا ضروری ہے ہر اک بونے کو بونا کہنا

پرتپال سنگھ بیتاب

زندگی کوہ نوردی (mountaineering) سے کم نہیں کیا ہی عمدہ تشبیہہ دی ہے اس شعر میں:

اونچا پہاڑ چڑھ کے اترنا پڑا اسے
جینے کا وقت آیا تو مرنا پڑا اسے

وسیع المشربی :

جانتا ہوں مجھے مروائے گا اک دن یہ مرا
دیر کو کعبہ تو کعبے کو کلیسا کہنا

مزید نمونۂ اشعار:

ایک گرتا ہے تو ایک آگے نکل جاتا ہے
قابلیت یہاں درکار نہیں ہے صاحب

تھی سرحدیں تو کڑی ہم بھی پرندے تھے
زمین تنگ تھی لیکن تھا آسمان کھلا

تھا تو پہاڑ ریت کا لیکن پہاڑ تھا
ہر لمحہ ذرہ ذرہ بکھرنا پڑا اسے

ضروری تو نہیں مدِّ مقابل دوسرا کوئی
کبھی خود اپنی آنکھوں میں کھٹکنا بھی ضروری ہے

غیر مردف غزلوں سے چند اشعار.

خواب سارے بتوں نے چھین لئے
مسلک اپنا اگر چہ تھا توحید

پہلے کیا خوب اک پتنگ اڑی
پھر ہوا میں ہی ڈور ٹوٹ گئی

باہر دھواں دکھائی نہ دے
اندر اندر جلا کرو

بنو نہ کسی کی پرچھائیں
اپنے جیسے بنا کرو

بیت گیا سو بیت گیا
اٹھو چلو کچھ نیا کرو

تیشہ چُپ، خاموش ہے آذر
پتھر میں بے چین ہے پیکر

ڈوب رہا ہے ابھر رہا ہے
ایک جزیرہ بیچ سمندر

ہانچ دریا تھے ایک تھا پنجاب
اور پانی میں تھی غضب کی مٹھاس

پرتپال سنگھ بیتاب

۲۳۔محمد رشید قمر

۱۹۵۰عیسوی

محمد رشید کا تعلق راجوری کے درہال قصبہ سے ہے ۔جموں کشمیر اکیڈمی کے پہاڑی شعبہ سے بطور کلچرل آفیسر ریٹائر ہو چکے ہیں پونچھ راجوری میں پکے نمائندہ شاعر ہیں پہاڑی کے علاوہ اردو میں عمدہ غزلیں کہی ہیں ۔ان کے بعض اشعار میں بلا کی روانی پائی جاتی ہے ۔انکی ایک غزل میں سوز دل اور اندرونی کیفیت ملاحظہ کریں۔

اشکوں سے مرے داغ کو دھویا نہیں جاتا
پُر رنج و الم دل ہے کہ کھویا نہیں جاتا

شرمندۂ تعبیر نہ ہو خواب تو آئیں
شب بھی ہے اندھیرا بھی ہے سویا نہیں جاتا

سوکھے ہوئے پھولوں کی طرح سانسیں ہیں اٹکی
اب ہار نیا اُن سے پرویا نہیں جاتا

تقدیر سے آیا تھا بھنور ڈوبتے لیکن
دل ان کا سفینہ ہے ڈِبویا نہیں جاتا

لے جاؤ قمر ساتھ نشاں اُن کے قدم کا
تقدیس کفن کی ہے یہ دھویا نہیں جاتا

محمد رشید قمر درہالوی

۲۴۔احمد شناس

۱۹۵۱عیسوی

احمد شناس کا تعلق شاہدرہ تھنہ منڈی سے ہے۔نہ صرف ہماری ریاست بلکہ قومی سطح پر اردو کے مشہور شاعر ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں احمد شناس کے حصے الفاظ کا جوہر آیا۔الفاظ کو وہ بڑی مہارت سے مناسب نشستوں پر بٹھاتے ہیں۔البتہ انکی شاعری عام فہم نہیں۔احمد شناس ان چھوئی زمینوں کا سفر کرتے ہیں۔بڑی بات ہے کہ وہ اپنے مشاہدے سے شعر کہتے ہیں۔احمد شناس نے الگ ہی راستہ بنایا ہے۔وہ کسی سے متاثر نہیں ہوئے اور نہ ہی انکا رنگ کسی سے ملتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ دوسروں سے متاثر شعرا شاید انکے رنگ

سے غیر آشنا ہیں۔ ''پس آشکار'' اور'' آب رنگ''شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ نئے نئے موضوعات نئی نئی پیکر تراشیاں کرتے رہتے ہیں۔

آنسو کی ایک بوند کو آنکھیں ترس گئیں
اس دھوپ میں جھلس گیا دوہا کبیر کا

لفظوں کی دسترس میں مکمل نہیں ہوں میں
لکھی ہوئی کتاب کے باہر بھی سن مجھے

ساتھ ہو لیتا ہے ہر شام وہی سناٹا
گھر کو جانے کی نئی راہ نکالی جائے

.....

یہ جو میری انگلیوں میں ہے اجالا حرف کا
ماورائے حرف بھی ہے اک ستارہ حرف کا

بچے نکال لائے ہیں خبریں نئی نئی
بوڑھے فلک کی جیب سے چیزیں نئی نئی

احمد شناس

''آب رنگ''احمد شناس کا تیسرا اردو شعری مجموعہ ہے برصغیر میں اردو غزل کے حوالہ سے احمد شناس کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ احمد شناس کی شاعری کی

او پری سطح ساکن و ایستادہ معلوم ہوتی ہے لیکن جونہی حساس قاری انکے اشعار کی گہرائی میں اترتا ہے تو اسکا سامنا ایک زبردست زیرِموج (undercurrent) سے ہوتا ہے یہ اِتجاہ خفی ،حساس قاری کے دل میں ہلچل مچاتا ہے اور انکے اشعار کی معنویت نیلگوں فضاوں میں ست رنگی دھنک کی طرح نظر آنے لگتی ہے ۔دراصل سچا شعر قطعی معنوی ترسیل کے بجائے ہمیں ایک دیرپا اور خارج از حدود کیفیت سے دو چار کرتا ہے ۔شعر ملاحظہ کریں ۔

مرا کمال یہ لکھے ہوئے حروف نہیں
مرے خیال کی ہے انتہا گلاب کا پھول

لکھے ہوئے حروف کسی حد تک گلاب کے پھول کا وصف تو بیان کر سکتے ہیں لیکن گلاب کے پھول کا نظارہ و مشاہدہ عیناً و کاملاً نہیں کروا سکتے ۔اشعار میں شاعر کے تخیل کا پورا اظہار ہو ہی نہیں سکتا ۔اب اگر ہم اس شعر کو دوبارہ پڑھیں تو بالیقیں ہم خود کو اس شعر کی معنوی رنگین کمان کے قریب تر پائیں گے ۔ہماری ریاست میں عہد حاضر میں احمد شناس ،شفق سوپوری ،رفیق راز ، پرتپال سنگھ بیتاب نے اردو غزل کو اس کنگرۂ بلند پر پہنچا دیا ہے ۔جہاں ریاست میں معدودے چند لوگ ہی پہنچ سکتے ہیں ۔بالخصوص احمد شناس کے دقیق مگر خوبصورت اشعار کی توضیحات کی کوششیں لاحاصل بھی ہو سکتی ہیں کیونکہ احمد شناس نے ایسی ایسی نازک پیکر تراشیاں کی ہیں کہ جو ذرا سے چھیڑ چھاڑ سے اپنی فطری لوچ کھو بیٹھتی ہیں ۔احمد شناس فکر و فن کے بلند مقام پر جا

پہنچے جہاں سے انکے دیکھنے اور عام قاری کے دیکھنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

عالم نور سے نکلے ہیں اندھیرے کتنے
چادرِ خوف میں لپٹے ہیں سیانے کتنے

محولہ بالا اشعار میں" نور سے اندھیرے نکلنا"،" سچی بات کا کفر بننا" بالکل نئے خیالات ہیں ۔" شوکتِ جسم کا خالی کشکول سا نکلنا"، عمدہ خیالات اور تازہ استعارے ہیں۔فقیر کا کشکول کبھی بھرتا نہیں یہ جسم اگر چہ خدا کا عطیہ ہے لیکن آخرش اس سے بھی آدمی کو دست بردار ہونا ہی پڑھتا ہے ۔ہڈیوں کا ڈھانچہ خالی رہ جاتا ہے۔اور وہ بھی مٹی سے مل جاتا ہے۔ یہاں شاعری کی سرحدیں ساحری سے جا ملتی ہیں۔

کیا سحر تھا بولے ہوئے الفاظ میں میرے
تم یاد دلاتے رہو میں بھول گیا ہوں

احمد شناس

احمد شناس نے پہلے دو شعری مجموعوں کے مقابلہ میں تیسرے شعری مجموعہ" آب رنگ"، میں قدرے سہل زبان استعمال کی ہے استعارے بہت ہی شفاف اور روشن ہیں۔میرے خیال میں احمد شناس کا شعری سفر نہایت بلند و مرتفع منزل تک جا پہنچا ہوں۔اور اب انکے اشعار پختہ اور رس بھرے میووں جیسے معلوم ہوتے ہیں اس کے برعکس بعض شعراء ایسے بھی ہیں جو

خود پی کر ذائقہ محسوس نہیں کرتے بلکہ وہ بس دوسروں کی خوشبوئیں چراتے ہیں۔بقول رومی

لم یذق لم یدر ہر کس کو نخورد
کی بوہم آرد جعل انفاس ورد

میرے خیال میں احمد شناس کی پہچان سہل ممتنع اشعار کے بجائے ان کے پیچیدہ اور دقیق اشعار ہیں جو پیکر تراشی اور استعارہ کی تازگی کے اعتبار سے منفرد و ممتاز ہیں۔مثلاً

دور اڑتے ہوئے امید کے بادل یونہی
جابہ جا دشت میں تالاب بنا دیتے ہیں

بہت منہ زور ہے اُس کے لبِ شیریں کی خواہش
کہ گل اب خود بخود اپنے مگس تک آ گیا ہے

انا کی شاخ سے اُس نے اٹھالیا مجھ کو
یہ انتخاب بھی کیا انتخاب دیکھا ہے

احمد شناس

.....

۲۵۔آنند لہر

۱۹۵۲تا۲۰۱۸عیسوی

شام سندر آنند لہر کی پیدائش پونچھ میں ہوئی بی ایس سی کے بعد ایل ایل

بی کی اور انہوں نے ہائی کورٹ کی وکالت میں نمایاں نام کمایا۔آنند لہر نے افسانہ نگاری اور ناول نگاری کے میدان میں یادگارِ زمانہ ہیں ۔سرحد کے اس پار، انحراف ،کورٹ مارشل، بٹوارہ اور سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے مشہور افسانوی مجموعے ہیں ۔کے علاوہ ناول بھی لکھے ان میں اگلی عید سے پہلے، یہی سچ ہے ۔اور نامدیو ناولیں ہیں مزید ڈرامے بھی لکھے ہیں نروان تپسوی کون اور سرحد ڈرامے کے مجموعے ہیں ۔آنند لہر کی کہانیوں اور ناولوں مے تراجمہ انگریزی ہندی اور پنجابی میں بھی ہو چکے ہیں ۔

.....

۲۶۔خورشید کرمانی

۱۹۵۴عیسوی

خورشید کرمانی بنیادی طور فتح پور منڈی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن عرصہ سے پونچھ شہر آباد ہیں ۔ ۱۹۹۰عیسوی کے آس پاس مسعود الحسن مسعود اور خورشید کرمانی نے پونچھ میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔انکی دیکھا دیکھی نئی پود پروان چڑھی جن میں انور خان ،لیاقت جعفری ،ہارون راٹھور شامل ہیں ۔اس اعتبار سے خورشید کرمانی پونچھ میں نئی شعری روایت کے پیش رو ہیں ۔ شریف النفس انسان مہر وخلوص کے پیکر ہیں ۔نمونہ کلام :

ہم سورج کے ساتھ کھڑے تھے
پھر بھی گھر تاریک پڑے تھے

میری ان سے کیسے نبھتی
ان لوگوں کے نام بڑے تھے

شہر کا بچنا ناممکن تھا
جھٹ سے دریا آن چڑھے تھے

○

گھر میں لگتی ہے بیابانی مجھے
چاٹ نہ لے دشتِ امکانی مجھے

پیاس بجھنے کا کوئی امکاں نہیں
آگ کردیتا ہے اب پانی مجھے

پیاس بجھنے کا کوئی امکاں نہیں
آگ کردیتا ہے اب پانی مجھے

میرے حق میں اب دعا کرتے رہو
مار دے نہ میری سلطانی مجھے

کیا پتہ ہے اب کہاں لے جائے گی
اس بدن دریا کی طغیانی مجھے

.....

سانپ جیسی چیز اک گھر میں رکھیں
پھر رات ساری اُس سے ڈر کے دیکھ لیں

.....

کھڑکیاں کھلتی ہیں اب بھی چاپ پر
اُس گلی سے پھر گذر کر دیکھ لیں

ڈرتے ڈرتے سوچ رہا ہوں
خود سے کتنا خوف زدہ ہوں

ہمت کیسی مجبوری ہے
تنہا دریا روک رہا ہوں

سایہ اپنا دیکھ کے سوچوں
قد آور ہوں اور بڑا ہوں

.....

۲۷۔فاروق مضطر

۱۹۵۴عیسوی

راجوری سے تعلق رکھتے ہیں ۔ہمالین کالج آف راجوری کے بنیاد گذار اور سر پرست اعلےٰ ،مقتدر علمی و ادبی شخصیت ہیں ۔ ۱۹۷۴عیسوی میں راجوری سے" دھنک" ادبی جریدہ شایع کیا۔جس کے کچھ شمارے، ای بکس ریختہ پر محفوظ ہیں ۔جب تک فاروق مضطر نے شاعری کی ،سخن وقلم کا وقار قائم رہا پھر انصرامی مہمات میں مصروف ہو گئے ۔لیکن ادب سے اب بھی بدستور محبت کرتے ہیں اور ادیبوں کے مخیر اور قدر دان ہیں ۔منفرد لہجہ کے شاعر نہایت خلیق اور زندہ دل شخصیت کے مالک ہیں ۔بعض اشعار:

ہمارا ربط و تعلق ہے چند شاموں کا
شجر پہ طائر موسم کا آشیاں جیسے

مگر ان آنکھوں میں کس صبح کے حوالے تھے
ہمارے نام کے سارے حروف کالے تھے

مثالِ برق گری اک آن تیغ ہوا
ابھی دریچوں سے لوگوں نے سر نکالے تھے

فاروق مضطر

.....

میں طائرِ وجود یا برگِ خیال تھا
بس اس قدر ہے یاد کہ میں ڈال ڈال تھا

لمحوں میں مجھ کو بانٹ گیا کوئی کالا ہاتھ
ورنہ میں آپ اپنا طلوع و زوال تھا

چہرے کھلی کتابوں کی مانند تھے مگر
بے روشنائی لکھے کو پڑھنا محال تھا

مضطرؔ ہر آئنے میں تھا عکس بہار بس
میں اپنی آرزو سے بہت پائمال تھا

○

قربتیں بڑھ گئی نگاہوں کی
اب حدیں ختم ہیں لباسوں کی

دھوپ روکے کھڑی ہے کس کے لئے
یہ سر رہ قطار پیڑوں کی

اور پھیلے گا آگ کا دریا
اور جھلسے گی کھال چہروں کی

خودکشی کا سفر بھی سہل نہیں
بھیڑ سی ہے لگی سوالوں کی

کون خود میں سمو سکا ہے کبھی
وسعتیں لازوال لمحوں کی

کب سے دہرا رہا ہوں میں مضطرؔ
ایک فہرست چند ناموں کی

فاروق مضطر نے خوبصورت غزلوں کے علاوہ عمدہ نظمیں بھی کہی ہیں۔ فاروق مضطر کے کلام میں استعاروں کی تازگی اور علامتوں کی بشاشت اپنی مثال آپ ہے۔ فاروق مضطر کے اشعار سپاٹ یا سطحی ہونے کے برعکس اپنے اندر کئی معنوی پرتوں کے حامل ہیں۔ انہوں نے روایت کی شاخ پر جدّت کا خوش رنگ پیوند بڑی مہارت سے لگایا ہے۔

شاہراؤں سے گریزاں ہے مگر کچھ سوچ کر
عادتاً پہلے تو وہ پگڈنڈیاں چلتا نہ تھا

نیچے دی گئی غزل کے مقطع میں نقش کا حادثہ سے دوچار ہونا اور پھر اس سلسلہ کو وہم و یقین سی جوڑ دینا یہ کمال فقط فاروق مضطر کے حصہ میں آیا

ہے۔اس شاہکار غزل کے پانچوں اشعار پیکر تراشی اور تخیل آرائی کے عمدہ نمونے ہیں۔

○

نقش آخر آپ اپنا حادثہ ہوجائے گا
اور طے وہم و یقیں کا مرحلہ ہوجائے گا

گونج اٹھیں گے در و دیوار اپنے کرب سے
لفظ جو تشنہ ہے معنی آشنا ہوجائے گا

جسم بھی پگھلیں گے سائے بھی نہ ٹھہریں گے کبھی
جانے کب یہ سبز منظر بھی ہوا ہوجائے گا

لوگ سب اس کی کہانی جان لیں گے حرف حرف
اور وہ خوش پوش کھل کر بے ردا ہوجائے گا

پیڑ اگلیں گے سیاہی کا سمندر دیکھنا
موسم خوش رنگ مضطر، زخم پا ہوجائے گا

فاروق مضطر

.....

۲۸۔زنفر کھوکھر

۱۹۵۷عیسوی

زنفر کھوکھر ۱۹۵۷ عیسوی میں تحصیل مینڈھر کے گاؤں گلھوتہ میں پیدا ہوئیں ۔ ۱۹۷۵ میں زنفر کی شادی ساج ،راجوری میں ہوئی ۔زنفر کھوکھر کے افسانہ کئی جرائد میں چھپ چکے ہیں ۔جیسا کہ پہلے بھی بتایا جاچکا ہے ۔انکے چار افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں ۔خوابوں کے اُس پار، کانچ کی سلاخ، عبرت، پتھر کی سل ۔ اسکے علاوہ انشائیے اور مضامین بھی لکھے ہیں ۔ زنفر کھوکھو کر ہمارے پچھڑے ہوئے علاقہ کی خواتین وحضرات کے لئے مشعل راہ ہوسکتی ہیں ۔

.....

۲۹۔میر خورشید جانم

(۱۹۵۸عیسوی)

جان لیوا ہے عارضہ دل کا
اب بھلا کیا کرے دوا کوئی

میر خورشید جانم

میر خورشید جانم کا تعلق خاص راجوری شہر سے ہے ۔ ایم اے تاریخ کرنے کے بعد مدرس ہوگئے بطور پرنسپل فرائض انجام دینے کے بعد سبکدوش ہوچکے ہیں ۔ ۵ اپریل ۱۹۷۹ عیسوی کو "انجمن خدام ادب ضلع

راجوری کا قیام عمل میں لایا۔ جانم اس انجمن کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ موصوف شاعری کے لئے مطالعہ ومصوری کا شوق بھی رکھتے ہیں۔ تشکیل رسالہ بھی شائع کرتے رہے عرصہ سے یہ سلسلہ منقطع ہو چکا ہے۔ نمونہ کلام

کرکے بدنام مجھے تو بھی تو رُسوا ہوگا
سوچ لے کیا تیری خاطر یہی اچھا ہوگا

میری اوقات مجھے یاد دلانے والے
اپنے ماضی کو تو کس طور بھولا ہوگا

ترکِ الفت کا اکیلا میں گنہگار نہیں
تو نے فرصت میں بہت دیر تک سوچا ہوگا

وعدہ شکنی کا مجھے پاس نہیں مان لیا
وعدہ شکنی کا تیرے سر بھی تو سہرا ہوگا

بے وفاؤں کی کبھی ہوگی جو مرتب فہرست
سرِ فہرست ترا نام بھی لکّھا ہوگا

میری ہستی ہے فقط ایک مسافر جیسی
بعد جانے کے مِرے سفر کا چرچا ہوگا

ایسے لوگوں سے بغل گیر نہ ہو اے جانم
آستینوں میں خدا جانے کیا رکّھا ہوگا

میر خورشید جانم

.....

۳۰۔ مستور شادؔ

۱۹۵۹ تا یکم دسمبر ۲۰۱۷ عیسوی

اصلی نام مستور احمد ملک تھا مرحوم بفلیاز سرنکوٹ کے باشندے تھے اردو پہاڑی میں شاعری کرتے تھے۔ سرنکوٹ میں کرشن چندر میموریل کی سرپرستی میں ہونے والی نشستوں میں ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ ۲۰۱۲ء میں انہوں نے اردو شعری مجموعہ ترتیب دیا تھا ناسازیٔ صحت کی وجہ سے شایع نہ کرسکے۔ دسمبر ۲۰۱۷ عیسوی میں وفات پا گئے۔ چھوٹی بحر میں اچھی غزلیں کہیں ہیں۔ ان کی غزلوں میں اثر آفرینی پائی جاتی ہے۔

○

خالی کمرہ ڈر لگتا ہے
وحشت کا منظر لگتا ہے

اب کے کیسی فصل اُگی ہے
پھول بھی اب پتھر لگتا ہے

اس کی بات میں زہر ہو جیسے
ایسا کیوں اکثر لگتا ہے

چاند کی لو میں اس کو دیکھا
میلی سی چادر لگتا ہے

ناداں ہے خود ہی سنبھلے گا
آج اگر بے پر لگتا ہے

○

کہاں ہیں برف پہ خوشبو کی تتلیاں اب کے
سراپا آگ ہیں خوابوں کی بستیاں اب کے

ہیں کیسی تیز ہواؤں کی زد پہ گل سارے
سسک رہی ہیں گلابوں کی پتیاں اب کے

ترے خرد کا کہاں کھو گیا ہے آج لباس
جنوں کے ہاتھ سے اُڑتی ہیں دھجیاں اب کے

یہ کون خوش ہے فضاؤں سے توڑ کر رشتے
بھٹک رہی ہیں ہواؤں کی تتلیاں اب کے

لہولہان ہے دھرتی، ہے آسماں خوں ریز
عجیب تر ہیں یہ آدم کی مستیاں اب کے

تمہارا کرب لکھوں میں مگر لکھوں کیسے؟
لرز رہی ہیں ان ہاتھوں کی انگلیاں اب کے

ڈبو کے خون میں تاریخ داں نے اپنا قلم
جبین وقت پہ لکھ دی ہیں سُرخیاں اب کے

بجھا کے کون گیا ہے یہ منظروں کے چراغ
اداس شاد ہیں ساری ہی بستیاں اب کے

مستور شاد

....

۱۳۔ڈاکٹر رفیق انجم

۱۹۶۲عیسوی

رفیق انجم آوان موضع کلائی پونچھ میں پیدا ہوئے ۔بہ حیثیت میڈکل آفیسر پھر امراض اطفال رہے ۔آجکل اردو کے پرفیسر ہیں ۔رفیق انجم اردو اور

گوجری میں تحقیقی تنقیدی کئی کتابوں کے مصنف ہیں ۔ اردو میں "خواب جزیرہ" اور "آکاش"، زنبیل (حصہ اردو) شعری مجموعے اور گوجری میں دل دریا مشہور ہے۔

غزل کے اشعار:

تم نہیں تو زندگی میں اور کیا رہ جائے گا
عکس مٹ جائیں گے سارے آئینہ رہ جائے گا

جو ابھی سے بجھ گئے تیری وفاؤں کے چراغ
دور تک اندھے سفر کا سلسلہ رہ جائے گا

اب بھی مجھ سے چھین لیتے ہیں مجھے
چودھویں شب، چاندنی اور تیرا شہر

مجھ کو لے بیٹھی وفا کی جستجو
چارسو آوارگی اور تیرا شہر

○

پریشاں زندگی ہے اور ہم ہیں
تری بیگانگی ہے اور ہم ہیں

شبِ تاریک میں یادوں کی خوشبو
ذرا سی چاندنی ہے اور ہم ہیں

اُدھر موجِ جوانی اور تم ہو
اِدھر تشنہ لبی ہے اور ہم ہیں

ہماری زندگی کیا زندگی ہے
کہ جاں تو چھن گئی ہے اور ہم ہیں

غموں کی بھیڑ میں کھوئے ہیں انجم
بس اک اُن کی کمی ہے اور ہم ہیں

رفیق انجم

.....

۳۲۔غنی غیورؔ

۱۹۶۲عیسوی

''عبدالغنی جاگل نام اور تخلص غنی غیورؔ ہے۔آپ ۱۲/اپریل ۱۹۶۲ء کو تحصیل مینڈھر ضلع پونچھ کے گورسانی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ان کی مطبوعہ کتابوں کے نام اس طرح ہیں۔سروش (۲۰۱۴ء) تن ورق تحریر (۲۰۱۷ء)، حکایت نیم شب (۲۰۱۶ء)،نقش دگر (۲۰۱۸ء) دیر تک (۲۰۱۹ء) محیط بے

ساحل (۲۰۲۰ء) نئی اردو شاعری (۲۰۲۱ء) قلم قلم روشنی (۲۰۲۲)، سعدی سخن و قلم (۲۰۲۲ء)، نرگس شہلا (۲۰۲۳ء)، دستور زبان محلی گوجری (۲۰۲۳ء)، آزار جاں (۲۰۲۳ء) اور مقالات غنی غیور (۲۰۲۳)، نخل نور (۲۰۲۳)، دیر تک (۲۰۱۹)، صندل پیکر (۲۰۲۳)، سُلگتا صحرا (دوسرا ایڈیشن ۲۰۲۳ء) غزلیات غنی غیور ۲۰۲۵ء کے علاوہ عنقریب ہی ان کی چند اور کتابیں بھی شائع ہونے کی امید ہے۔ کتابوں کے عنوانات سے پتہ چلتا ہے کہ غنی غیورؔ شاعر، افسانہ نگار، محقق، مضمون نگار اور نقاد کی حیثیت سے شعر و ادب کی نمایاں خدمت کر رہے ہیں۔"

اقتباس از اردو صوبہ جموں میں اردو قلم کار جلد ۴، از ولی محمد اسیر کشتواری۔

نمونہ کلام

○

تسبیح کے دانے سے وہ زنار سے آگے
تائید سے آگے کسی انکار سے آگے

آساں نہیں زخموں کے کچوکے سنئے سہنا
اظہارِ حقیقت بھی ہے تلوار سے آگے

چاہا کہ درختوں سے کروں ذکرِ محبت
محسوس کیا، کچھ تو ہے اشجار سے آگے

وہ اشک جو پلکوں پہ ہی ٹھہرا رہا عرصہ
دامن کو بگھونے چلا رفتار سے آگے

تہذیب کے کانوں کو سنائی نہیں دیتا
رسموں کا فقط شور ہے تہوار سے آگے

خود اپنے ہی اشعار پہ حیراں ہوں غنی میں
احساس مرا پہنچا ہے اظہار سے آگے

○

گھاس کے ریشے سے تلوار نکل آتی ہے
پھول سے چڑیا کی چہکار نکل آتی ہے

شوق پیدا ہُوا دل میں جو سرِ شاخ آنے کا
سر سے غنچے کے بھی دستار نکل آتی ہے

کون کہتا ہے غریبوں کے لئے جیتے جی
ایک دو گز جگہ ہموار نکل آتی ہے

شوق ہی تیر کے پہلو میں اگاتا ہے پر
اور بھی عزم سے رفتار نکل آتی ہے

ایک تقریر ہے تاثیر سے خالی اس کی
ایک کردار سے گفتار نکل آتی ہے

دیر ہے بس شورِ منصور و مسیحا کے آنے کی
سوکھی ٹہنی سے بھی اک دار نکل آتی ہے

○

آنسوؤں میں کیا دیکھتا ہوں دیر تک
دھند میں کیا دیکھتا ہوں دیر تک

جس گلی کے دونوں رستے بند ہیں
اُس گلی میں دوڑتا ہوں دیر تک

خامشی بھی کوئی جھرنا ہے اگر
کس لئے پھر بولتا ہوں دیر تک

کھل گئیں ہیں کھڑکیاں الفاظ کی
اور اُن سے جھانکتا ہوں دیر تک

چیونٹیوں کے بِل میں پانی ڈال کر
میں تماشا دیکھتا ہوں دیر تک

روح میلی ہوگئی میری غنیؔ
اپنا چولا جھاڑتا ہوں دیر تک

○

باغی حدود سے بہت آگے نکل گئے
سورج چھوا نہ تھا کہ مرے ہاتھ جل گئے

یہ مورتوں کے بیچ میں حیرت زدہ نقوش
کیسے تماشبین تھے پتھر میں ڈھل گئے

جذبات میں کچھ اس طرح اس کا بدن تھا سرخ
زنجیر آہنی کے کڑے ہی پگھل گئے

بگلوں سے ان کے روپ بھگت بن کے آئے کچھ
مکھی کو یار چھوڑ کے ہاتھی نگل گئے

ٹیلے سے ان کے جسم پھواروں میں تھے مگن
تیراک آنکھ والے مگر مچھ اچھل گئے

بس دیر پانی ڈالنے کی تھی غنی غیور
اور دفعتہً چیونٹیوں کے بل اُبل گئے

○

پتھر کے منہ میں سبز زباں دیکھتا ہوں میں
امید کا یہ تازہ جہاں دیکھتا ہوں میں

تو ہر قدم پہ رستہ بدلتا ہے اس لئے
سو دل میں تیرے وہم و گماں دیکھتا ہوں میں

ہر سُو ہیں دھوپ جیسے فریبوں کے نقش پا
گاہے یہاں، گاہے وہاں دیکھتا ہوں میں

اک شور ہے جو سانس کی دیوار میں چھپا
خاموشیوں کے بیچ مکاں دیکھتا ہوں میں

دیتا ہے صلح کا بھی وہ پیغام کس لئے
ہاتھوں میں اس کے تیر و کماں دیکھتا ہوں میں

جلتے ہوئے مکانوں سے جو نکلی روشنی
سایوں میں بھی غیور دھواں دیکھتا ہوں میں

غنی غیورؔ

.....

۳۳۔شفیق مسعود

۱۹۶۳عیسوی تا۱۹۹۸عیسوی

شفیق احمد مسعود کا تعلق راجوری قصبہ سے تھا۔تفہیم کے مدیر عمر فرحت کے سگے ماموں تھے شفیق مسعود کا کارنامہ ''جب گدھ لوٹ آئے'' افسانوی مجموعہ ہے۔ یہ علامتی افسانہ میری نظر سے گذرا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ مصنف کا یہ شاہکار ہے یہی وہ افسانوی مجموعہ جس پر بلراج کومل، شمس الرحمٰن فاروقی اور نیر مسعود نے تعریفوں کے ڈونگرے برسائے تھے۔شفیق مسعود کا انداز علامتی اور تجریدی کے بیچ کا راستہ ہے۔شفیق مسعود کے مطبوعہ افسانوں کی تعداد دس ہے۔

۳۴۔بشارت حسین خان

۱۹۶۳عیسوی

آکاش نہ جس کو راس آئے اور دھرتی بھی اک بوجھ لگی
وہ آس کا پنچھی ہر لمحہ گرتا بھی رہا اُڑتا بھی رہا

رشتے ناطے بندھن سارے، مانا خواب جزیرے ہیں
لیکن تری یاد میں نکلے آنسو موتی ہیرے ہیں

سیدھی راہ اسی کو بھائے، جس کا مُرشد کامل ہو
دیکھو تو کچھ لوگ یہاں پر، بے مُرشد بے پیر ہیں

.....

ہر دل کو پھر سے گرما دے
کردار کی خوشبو سے بابا!

یہ دل ہی مُلّا زاہد ہے
تو اس سے فتویٰ لے بابا

.....

اسے آنے دو مِرے گھر کی جانب
وہ لگتا ہے مِرا مہمان ہوگا

محبت کی ڈگر پر چلنے والو
تمہارا راستہ سُنسان ہوگا

اک ہو کا یہ عالم ہے انسانوں کی بستی میں
جنگل کے درندوں کو اس بات پہ حیرت ہے

بشارت حسین خان

بشارت حسین خان کا تعلق موضع بنولا مینڈھر سے ہے۔ علیگڑھ سے ۱۹۸۶ عیسوی میں ایل ایل بی مکمل کی۔ انہیں اپنے گاؤں کے ماحول سے اتنی محبت ہے کہ نوکری کے لئے کبھی فارم ہی نہیں بھرا۔ پچھلے پینس چھتیس سالوں

سے مینڈھر کورٹ میں وکالت کرتے ہیں طبع زاد شاعر ہیں۔ البتہ کوئی کتاب شائع نہ کی ہے اردو پہاڑی اور گوجری میں شعر کہتے ہیں۔

دشت نوردی، صحرا گردی کام رہا
ہر بابِ عشق میں لکّھا میرا نام رہا

بشارت خان کا کمال یہ ہے کہ مقامی بول چال کے الفاظ کو نہایت موزونیت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں مثلاً چھترول ہونا یا کرنا، پول کھلنا ڈھول مقامی الفاظ کا حسن استعمال ملاحظہ کریں۔

پھیکا پھیکا ہے ماحول خدا خیر کرے
اپنی کشتی بھی گئی ڈول خدا خیر کرے

ہم تو دنیا کی امامت کا سبق بھول گئے
اب تو ہے ہاتھوں میں کشکول خدا خیر کرے

جب سے چھوڑا تجھے ذلّت نے ہمیں گھیر لیا
اپنے ہاتھوں ہوئی چھترول خدا خیر کرے

کھو دیا ہم نے ہی تھا بھیڑ میں چلنے کا ہنر
کجروی کھول گئی پول خدا خیر کرے

لاکھ پردوں میں بھی کردار نظر آتا ہے
پیٹتے رہتے ہیں ہم ڈھول خدا خیر کرے

ہم مسافر ہیں بشارت تو سفر پر نکلیں
راہ پُر پیچ ہے پُر ہول خدا خیر کرے

بیچتا پھرتا ہے جھوٹی آن کو
جینے کے سب ڈھنگ ہیں اس شعر میں

زندگی تو ایک دن ٹھکرائے گی
موت کے صد رنگ ہیں اس شہر میں

کیا تماشا ہونے والا ہے یہاں
پھر سیاسی رنگ ہیں اس شہر میں

○

اگر یہ آدمی انسان ہوگا
سفر اے زندگی آسان ہوگا

محبت کی ڈگر پر چلنے والو
تمہارا راستہ سُنسان ہوگا

تمہارے نام کی تفسیریں لکھوں
مکمل پھر مِرا دیوان ہوگا

اسے آنے دو مِرے گھر کی جانب
وہ لگتا ہے مِرا مہمان ہوگا

درو دیوار پر لکھّا بشارت
سنہرے وقت کا فرمان ہوگا

بشارت حسین خان

.....

۳۵۔ پرویز ملک

۱۹۶۴ عیسوی

پرویز ملک کا تعلق درہال سے ہے۔اردو گوجری اور پہاڑی میں خوبصورت شاعری کرتے ہیں۔غزل کہتے بھی ہیں۔اور جب اپنا کلام ترنم سے پڑھتے ہیں تو مشاعروں میں چھاجاتے ہیں۔لاابالی اور مست ملنگ شخص ہیں۔دنیا جائے باڑ میں وہ تو بس اپنی مستی میں رہتے ہیں۔بقول غالبؔ ع

اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

عوامی حلقوں میں بہت مقبول ہیں۔ہمارے یہاں فکری شاعری کے بجائے شاعری کو تفریحی سرگرمی کے طور پر لیا جاتا ہے۔بہر حال یہ بھی شاعری کا

ایک رخ ہے۔

ہم تو پھولوں کو نہ کھلنے کی نصیحت دیں گے
لوگ بے درد ہیں چٹکی میں مسل دیتے ہیں

آنکھ سے آنکھ تو دل دل سے ملا کر دیکھیں
آؤ اک روز چراغوں کو جلا کر دیکھیں

جوانی بیچنے نکلے تھے گھر سے
شہر پہنچے تو بوڑھے ہوگئے تھے

کسی کو دیکھنے کا شوق ہم کو
کچھ اتنا تھا کہ اندھے ہوگئے تھے

تمہارے جگمگاتے شہر میں ہم
بہت میلے کچیلے ہوگئے تھے

سخت تیور نہ میرے ہاتھ کا پتھر دیکھو
میں بہت نرم ہوں آؤ مجھے چھوکر دیکھو

شہر کی یار! فلک بوس فصیلیں نہ گنو
رات سر پر ہے چلو کوئی کھلا در دیکھو

میرے پیروں میں تو زنجیر مری اپنی ہے
کس کے نیزے پہ ہے پرویز مرا سر دیکھو

پرویز ملک

.....

۳۶۔مرزا فاروق انوار جرال

تاریخ پیدائش ۱۹۶۴ عیسوی

مرزا فاروق انوار جرال کا تعلق راجوری سے ہے انوار پہاڑی اور گوجری میں طبع آزمائی کرتے ہیں پہاڑی میں" چانن" شعری مجموعہ منظر عام پر آچکا ہے۔اردو میں بھی اشعار کہتے ہیں ان کا بعض کلام معتبر جرائد اور رسالوں میں شائع ہو چکا ہے۔غزل خوب کہتے ہیں۔نمونۂ کلام

ہے جُرمِ عشق، حاصل تسکین زندگی
کس کی مجال ہے کہ بچے اس گناہ سے

سب کی زباں پہ تھا ترا چرچا تمام رات
چھت پر تمہاری چاند بھی ٹھہرا تمام رات

جس کے لئے تھی آہ مری، فرشِ راہ سی
آیا وہ جب تو غیر کے ٹھہرا تمام رات

میں ہی نہ اک وجود کی صورت سمٹ سکا
دیکھا اسے تو ریت سا بکھرا تمام رات

نکلا تھا بحرِ بیکراں کی سیر کے لئے
لیکن میں بوند بوند کو ترسا تمام رات

انوار ظلمتِ شبِ ہجراں میں تُو ہی بس
اک آسرا تھا، آس تھا، تنہا تمام رات

فاروق انوار مرزا

.....

۳۷۔ ذوالفقار نقوی

۱۹۶۵ عیسوی

ذولفقار نقوی نے انگریزی کو بطورِ پیشہ پڑھایا اور اردو کو جذبۂ دل سے لکھا۔ ابتدا میں بحیثیتِ لیکچرر تقرر ہوا اور اب ایک ہائیر سیکنڈری ادارے کے پرنسپل کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں، اور امسال وہ سبکدوشی کی پُر وقار دہلیز پر کھڑے ہیں۔ ذوالفقار نقوی کے اب تک تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کے نام یہ ہیں ''زادِ سفر''، ''اجالوں کا سفر'' اور ''دشتِ وحشت''۔ ذوالفقار نقوی شریف النفس عمدہ شاعر ہیں۔ ذوالفقار نقوی نے مرثیہ نگاری کے ساتھ ساتھ پابند نظم میں بھی اپنی فنی مہارت کا لوہا منوایا ہے، اور وہ آج

بھی شعر و سخن کے سفر میں پوری یکسوئی اور جذبے کے ساتھ رواں دواں ہیں۔ نمونۂ کلام

بے چینی کے لمحے سانسیں پتھر کی
صدیوں جیسے دن ہیں راتیں پتھر کی

پتھرائی سی آنکھیں چہرے پتھر کے
ہم نے دیکھیں کتنی شکلیں پتھر کی

○

ٹیک لگا کر بیٹھا ہوں میں جس بوڑھی دیوار کے ساتھ
مٹ جاؤں گا میں بھی شاید اس کے ہر آثار کے ساتھ

غازہ پاؤڈر مل کر میں بھی آ جاتا ہوں سرخی میں
بک جاتا ہے چہرہ میرا سستے سے اخبار کے ساتھ

نام پہ تیرے بٹتے ہیں اب شہر میں نقلی سب تریاق
کر جاتا ہے دھوکہ کوئی بستی میں بیمار کے ساتھ

ہوش کے ناخن لے تو سائیں کیوں یہ غوغا ڈالا ہے
دیکھ نہیں اب لے یہ چلتی نغمۂ دربار کے ساتھ

کس نے تجھ کو سونپی بھائی سرداری اس بستی کی
سب کے سب محشور یہ ہوں گے اپنے اپنے یار کے ساتھ

عمر تمامی شوق سے ہم نے ایک ہی تتلی پالی تھی
جب جب اس کو خواب میں دیکھا اڑتی ہے اغیار کے ساتھ

○

شعور و فکر سے آگے نکل بھی سکتا ہے
مرا جنون ہواؤں پہ چل بھی سکتا ہے

مرے گماں پہ اٹھاؤ نہ انگلیاں صاحب
گماں یقیں میں یقیناً بدل بھی سکتا ہے

پہاڑ اپنی قدامت پہ یوں نہ اترائیں
ابھر گیا کوئی ذرہ نگل بھی سکتا ہے

مرے لبوں پہ جمی برف سوچ کر چھونا
تمہارے جسم کا آہن پگھل بھی سکتا ہے

کوئی عصا بھی نہیں اور ہے اکیلا تو
امیر شہر کا اژدر نگل بھی سکتا ہے

ہمارے ساتھ جو چلنا ہے زاد رہ لے لو
کٹھن سے موڑ ہیں پاؤں پھسل بھی سکتا ہے

کرو نہ ضد کہ کسی شہر کی طرف جاؤں
مرے عزیز یہ دل ہے مچل بھی سکتا ہے

کر اپنے سائے سے راز و نیاز کی باتیں
بہت اداس ہے لیکن بہل بھی سکتا ہے

بس اک نظر جو کرم کی وہ اس طرف پھیرے
قدم بہک جو گیا ہے سنبھل بھی سکتا ہے

○

دشت میں دھوپ کی بھی کمی ہے کہاں
پاؤں شل ہیں مگر بے بسی ہے کہاں

لمس دشت بلا کی ہی سوغات ہے
مرے اطراف میں بے حسی ہے کہاں

خاک میں خاک ہوں بے مکاں بے نشاں
میرا ملبوس تن خسروی ہے کہاں

میرا سوز دروں مائل لطف ہو
مجھ میں شعلہ فشاں وہ نمی ہے کہاں

پھونک دے بڑھ کے جو تیرگی کا بدن
میری آنکھوں میں وہ روشنی ہے کہاں

صوت و حرف تمنا سے ہو با خبر
ایسی ادراک میں نغمگی ہے کہاں

○

مجھے زمان و مکاں کی حدود میں نہ رکھ
صدا و صوت کی اندھی قیود میں نہ رکھ

میں تیرے حرفِ دعا سے بھی ماورا ہوں میاں
مجھے تو اپنے سلام و درود میں نہ رکھ

کلیمِ وقت کے در کو جبیں ترستی ہے
امیرِ شہر کے بیکل سجود میں نہ رکھ

نظامِ قیصر و کسری کی میں روانی ہوں
وجوبِ عین ہوں صاحب شہود میں نہ رکھ

بچھا یقیں کا مصلیٰ درون ہستی میں
نیاز و راز کے قصے نمود میں نہ رکھ

پس وجود جہاں میری خاک ہی تو ہے
رموزِ ہستیٔ دوراں ورود میں نہ رکھ

ذوالفقار نقوی

.....

۳۸۔لیاقت نیّر

۱۹۷۳عیسوی

لیاقت نیّر،کا تعلق سرنکوٹ تحصیل کے دھندکگاؤں سے ہے۔علی گڑھ سے ایم اے اردو کی ڈگری کی ہے۔آجکل بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی میں ایسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔کئی تحقیقی مضامین اور کتابیں شایع ہو چکی ہیں۔"الفاظ سے آگے" سن اشاعت ۲۰۲۲ عیسوی" کانٹوں پہ زبان رکھ دی" سن اشاعت ۲۰۲۲ عیسوی" اجالے اپنی یادوں کے لیاقت نیر شعر و شاعری سے شغف رکھتے ہیں اور کلاسیکی غزل کہتے ہیں: لیاقت۔نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیں۔

اس قیامت میں اور کیا ہوگا
تیرے بارہ میں گفتگو ہوگی

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر
چشمِ نم مسکراتی رہی رات بھر

چاند تاروں میں انگڑائی لیتا رہا
چاندنی گُل کھلاتی رہی رات بھر

زلف گرتی رہی اس کے رخسار پر
زندگی ڈگمگاتی رہی رات بھر

میرے ادراک میں ہوئی شامل
خاک پھر خاک میں ہوئی شامل

کہ دشمن مرا یار جانی ہُوا
شرر بے مکاں تھا مکانی ہُوا

تیرے آنے کی ہے خوشی لیکن
تیرے جانے کا غم زیادہ ہے
لیاقت نیر

.....

۳۹۔پرویز مانوس
(۱۹۶۶عیسوی)

بارود جب رردیف ہو بندوق قافیہ
کیونکر نہ ہو خدایا مِرا فن لہو لہو

خوش تھا جو بہت گھر کو پڑوسی کے جلا کر
جلتا ہواخود اپنا مکاں دیکھ رہا ہے

نہر پر پہرہ لگایا ،جانے کیا وقتی یزید
ایک پیاسا کتنے صحراؤں کوپانی دے گیا

بچے تیرے اناج سمجھ کر نگل نہ لیں
کھیتوں میں اپنے زہر اگانا فضول ہے

ایک بھی مفلس نہیں ہے اب ہمارے شہر میں
ایسی افواہیں اُڑا کر دیکھ لینا چاہیئے

پرویز مانوس

پرویز مانوس کااصلی نام پرویز احمد بھٹ ہے پرویز مانوس کے والد پونچھ میں سرکاری ملازم تھے اور انہوں نے شادی پونچھ سے کی ۔اور مدت مدید تک پونچھ میں رہے ۔پرویز مانوس نے میٹرک پونچھ سے کی۔اور یہیں

ہی ملازم ہوئے ۔آجکل اپنے آبائی موضع نٹی پورہ کشمیر کے متوطن ہیں ۔ پرویز مانوس پہلے قلمی نام پرویز احمد بھٹ سے لکھتے تھے، بعد میں پرویز مانوس قلمی نام وتخلص کرتے ہیں ۔ان کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں ۔بیتے لمحوں کی سوغاتیں مطبوعہ ۱۹۹۲ عیسوی (پرویز مایوس قلم نام) اور موسم اڑان کا شعری مجموعہ کے علاوہ مٹھی بھر چھاؤں افسانوی مجموعہ ۔پرویز مانوس کی شاعری میں انکا ماحول سانسیں لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔پرویز مانوس کے یہاں کشمیر کے پُر آشوب حالات کی منظر کشی کی ہے ۔

جب سے ہوا ہے جھیل کا درپن لہو لہو
لگتا ہے آسمان کا دامن لہو لہو

اُگتی زمین میں زہر کی فصلوں کو دیکھ کر
ہونے لگے ہیں بھوک سے برتن لہو لہو

پھر سُن کے اپنے شہر میں اعلان بند کا
ہونے لگا غریب کا آنگن لہو لہو

لاشوں کو بیچ بیچ کے ہر سیٹھ نے یہاں
رکھا ہوا ہوا ''سیف'' میں جو دھن لہو لہو

بارود جب ردیف ہو بندوق قافیہ
کیونکر نہ ہو خدایا مرا فن لہو لہو

پرویز مانوس

.....

۴۰۔امتیاز نسیم ہاشمی

۱۹۶۹ عیسوی

میں تو صحرا تھا مگر سبز ہوا جاتا ہوں
جانے کس جسم کو چھو کے یہ ہوا آتی ہے

امتیاز نسیم پونچھی

امتیاز نسیم ہاشمی کا تعلق مینڈھر کے نڑول گاؤں سے ہے۔علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے اردو کے بعد اردو کے لیکچرار تعینات ہوئے۔اردو اور پہاڑی میں خوب شاعری کی ہے۔بہت پہلے پہاڑی شعری مجموعہ" چٹکا" منظر عام پر آچکا ہے۔بڑی بات یہ ہے کہ امتیاز نسیم ہاشمی شعر کی پہچان بھی رکھتے ہیں۔امتیاز نسیم کا اردو اور پہاڑی کلام شیرازہ کے علاوہ مقتدر جریدوں میں کلام چھپ چکا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مینڈھر میں تعیناتی کے دوران میری امتیاز نسیم ہاشمی سے گہری قربت ہوئی، جو رفتہ رفتہ اخلاص، محبت اور ادبی اشتراک

پر مبنی رفاقت میں بدل گئی۔ امتیاز نسیم ہاشمی نہ صرف بے حد فیاض انسان ہیں، بلکہ ادب سے ان کی وابستگی بھی غیر معمولی ہے۔ انہوں نے اپنی فیاضی کے مظاہر کے طور پر مجھے نایاب ادبی کتابوں کے متعدد قیمتی نسخے عاریتاً عطا کیے۔ سچ یہ ہے کہ میں نے ان کی فیاضی کے سلسلے کو نہیں روکا، بلکہ ان مستعار کتب کو اہلِ ذوق تک پہنچا دیا۔ اس طرح ان کی علمی سخاوت کا دائرہ وسیع تر ہو گیا، اور شاید یہی اُس فیاضی کا اصل حسن تھا۔

امتیاز نسیم ہاشمی شعر کم کہتے ہیں لیکن معیار پر زیادہ دھیان دیتے ہیں ۔نمونۂ کلام:

پہلے سب کھال اترتی ہے گھنی شاخوں کی
تب کہیں جاکے یہ پتّوں کی قبا آتی ہے

اے دیدۂ یعقوب تجھے کیا ہوا بتا
ایسا غمِ فراق مِری مستیوں میں ہے

ایک غزل کے چند اشعار:

دل پھر سے لرزتا ہے اُسی ایک شرر سے
گزرا تھا جو اکبار کبھی میری نظر سے

منظر ہی نہیں کوئی یہاں دید کے قابل
موسم بھی ہے بدلا ہوا کچھ خوں کے اثر سے

تاریک شبِ ہجر گراں بار تھی لیکن
خائف ہوں زیادہ ہی میں کچھ رنگِ سحر سے

اک دور کی آواز بُلاتی ہی رہی ہے
آگے نہ بڑھا میں بھی کبھی حدِّ بصر سے

پہنچا ہوں جہاں پر بھی بہت دھوپ کا مارا
پتّے ہی گرے ہوتے ہیں اس شاخِ شجر سے

○

یادِ جاناں جب سے طوفانی نہیں
اس لہو دریا میں طغیانی نہیں

وہ بھی میری بات کا قائل نہ تھا
میں نے اس کی بات بھی مانی نہیں

ڈھونڈتے ہوکس لئے صحراؤں میں
کیا تمہارے گھر میں ویرانی نہیں!

آزما تو بھی نہ مجھ کو چھوڑ مت
ہار میں نے بھی ابھی مانی نہیں

جسم تیرا خاک ہے تو کیا ہوا
حوصلہ تیرا مگر فانی نہیں

○

لفظ ٹھہرا ہے جو معنی کا جہاں ٹھہرا ہے
تیرے آشفتہ مزاجوں کا بیاں ٹھہرا ہے

رات ملتے رہے ہونٹوں کے کنارے باہم
صبح آنکھوں میں گلابوں کا سماں ٹھہرا ہے

دلِ ناداں میں نے روکا تھا جہاں جانے سے
تو بھی اُترا نہیں وعدوں پہ، وہاں ٹھہرا ہے

زندگی ہم نے توقع نہیں رکھی تجھ سے
سو نہ شرمندہ ہوئے اور نہ زیاں ٹھہرا ہے

دلِ بے رنگ میں اُتری ہے دھنک یادوں کی
درد مہکے ہیں کہ دردوں کا جہاں ٹھہرا ہے

○

کوئی کہتا ہے رات بھاری ہے
چار جانب سکوت طاری ہے

اک سمندر ہے اور پیاسا ہے
ایک دریا کو بے قراری ہے

سائے گھٹتے ہیں اور بڑھتے ہیں
ہم کو سورج سے شرمساری ہے

میں نے دیکھا ہے آئینہ جتنا
مجھ میں اتنی ہی خاکساری ہے

ایک تم ہو کہ بس نہیں چلتا
باقی دنیا تو سبھی ہماری ہے

.....

۴۱۔روبینہ میر

۱۹۶۹عیسوی

راجوری کے ایک علمی اور مقتدر گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں اور پونچھ راجوری سے پہلی خاتون ہیں جس نے پونچھ راجوری کے پسماندہ علاقہ میں سخن کی شمع فروزاں کی ۔ روبینہ میر سہل ممتنع غزل کہتی ہیں ۔ انکے شعری مجموعے،آئینۂ خیال،تفسیرِ حیات،حرفِ راز اور ضربِ قلم منظر عام پر آچکے ہیں ۔اپنے اشعار میں سماج کے غالب وقوی رجحان پر خفیف طنز کرتی ہیں ۔اور بعض غزلیں کلاسیکی طرز پر بھی کہی ہیں ۔

بات جو دل میں ہے کہہ سکتے نہیں
کیسی اپنی بے بسی ہے ہر طرف

سانس لیتے ہیں ہم کیسے ماحول میں
جو بھی منظر ہے وہ کربلا سا لگے

راز اب تک کسی پر نہ یہ کھل سکا
مر گئیں مچھلیاں کیسے تالاب میں

○

یوں نہ رنج و ملال کیجئے گا
یوں نہ جینا محال کیجئے گا

جن کا کوئی جواب ممکن ہو
ہم سے ایسے سوال کیجئے گا

ہم نے ہو آپ کا برا چاہا
پیش کوئی مثال کیجئے گا

لوگ پڑ جائیں جس سے حیرت میں
ایسا بھی کچھ کمال کیجئے گا

ہم کہ سنبھلے ہیں سخت مشکل سے
اب نہ پیدا وبال کیجئے گا

جس سے مضبوط دل کے رشتے ہوں
وہ تعلق بحال کیجئے گا

روبینہ میر

.....

۴۲۔لیاقت جعفری

۱۹۷۱عیسوی

لیاقت جعفری کا تعلق پونچھ سے ہے ۔بقول انور خان ۱۹۹۵ء میں رخسانہ جبین پونچھ میں ریڈیو اسٹیشن کی انچارج تھیں۔انور خان ،لیاقت جعفری، ذوالفقار نوی محترمہ رخسانہ جبین سے اصلاح لیتے رہے۔لیاقت جعفری ہائیر ایجوکیشن میں اردو کے اسسٹنٹ پروفیسر ہیں ۔سرینگر میں ایک تقریب کے دوران خود رخسانہ جبین نے بھی اس حقیقت کا اعتراف مجھ سے نہایت شدت سے کیا۔شعری و شاعری کی دنیا اور ملکی مشاعروں میں جانے پہچانے ہوئے شاعر ہیں ۔عام فہم لب ولہجہ ہے۔انکے ہلکے پھلکے اور رواں دواں اشعار قارئین اور سامعین کے دل و دماغ میں کھب جاتے ہیں۔ لیاقت جعفری کسی بھی خیال کو اپنے منفرد رنگ میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

درد نے میر تقی میر بنا رکھا ہے
مجھ کو اس عشق نے کشمیر بنا رکھا ہے

میں دوڑ دوڑ کے خود کو پکڑ کے لاتا ہوں
تمہارے عشق نے بچّہ بنا دیا ہے مجھے

مرے قبیلے میں تعلیم کا رواج نہ تھا
مِرے بزرگ مگر تختیاں بناتے تھے

.....

برسرِ عام تماشا نہیں لگنے والا
اب مرے چہرے پہ چہرہ نہیں لگنے والا

ایک ہی کھیت وراثت میں بچا ہے مجھ کو
اسکو بھی اب کوئی دریا نہیں لگنے والا

جعفری عشق کرو عشق کرو عشق کرو
بس اسی جرم میں پرچا نہیں لگنے والا

.....

بیٹھے بٹھائے عشق کا آزار لگ گیا
بستر کے ساتھ دوستو بیمار لگ گیا

پودا ہے ایک جسم میں امید نام کا
اک بار جو اکھاڑا تو سو بار لگ گیا

اک خواب نوچ پھینکا جو کل رات جعفری
آنکھوں میں میری نیند کا انبار لگ گیا

○

مسکراہٹ کو جیا غم کے سہارے ہم نے
زندگی کیسے سہے ناز تمہارے ہم نے

اختلافات رہے خود سے کئی برسوں تک
خود سے نفرت میں کئی سال گذارے ہم نے

پیاس نے توڑ دیا جسم کا رعشہ رعشہ
آخری سانس لی دریا کے کنارے ہم نے

نیند ٹوٹی تو یہ احساس ہوا آنکھوں کو
خواب تکنے میں کئی روز گذارے ہم نے

موج پھر جا کے سمندر سے بغلگیر ہوئی
ریت پر پھر سے کئی نقش ابھارے ہم نے

چیخ اُبھری تو ہواؤں نے اسے نوچ لیا
نام لے لے کئی دوست پکارے ہم نے

ہم نے ہر نیند تری آنکھ کے دل میں رکھ دی
اور دیکھے ہیں کئی خواب تمہارے ہم نے

لیاقت جعفری

.....

۴۳۔انور خان انور

۱۹۷۱ عیسوی

پونچھ شہر سے ہیں ۔اردو کے لیکچرار ہیں ۔باذوق شاعر ادیب اور براڈ کاسٹر بھی ہیں ۔ پونچھ کی ادبی محفلوں کی روح رواں سمجھے جاتے ہیں ۔سینکڑوں خوبصورت اردو اشعار از بر ہیں اور حاضر جوابی میں اپنی مثال آپ ہیں ۔اردو اور پہاڑی میں شاعری بھی کرتے ہیں ۔ہندی بحر میں خوبصورت شعر کہے ہیں ۔نمونۂ اشعار:

من مندر میں پیار کی کوئی گونج نہیں
بھیج کوئی میرا دیوانی یا اللہ

اپنے لشکر میں جب صرف بہتر تھے
ہم نے تب بھی ہار نہ مانی یا اللہ

میاں دل سے غلط فہمی نکالو
تمہارے بن بھی چل جائے گی دنیا

ہوا کے ساتھ اڑ جائے گا پانی
یہیں پھر لوٹ کر آئے گا پانی

ہماری پیاس یوں بڑھتی رہی تو
یونہی پھر آگ برسائے گا پانی

مسلسل بارشیں ہوتی رہیں تو
ہمارے گھر بھی آ جائے گا پانی

.....

۴۴۔ محتشم احتشام بھٹ

۱۹۷۱ عیسوی

احتشام بھٹ کا تعلق خاص منڈی، پونچھ سے ہے۔ ایک علمی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ سوز و درد میں ڈوبے ہوئی غزلیں کہتے ہیں۔ سماجی و فلاحی کارکن ہیں اور مخلص انسان۔ محتشم احتشام بھٹ پونچھ کے معروف شاعر بشیر بھٹ کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ بشیر بھٹ کی طرح بہت ولولہ انگیز اشعار کہتے ہیں
۔نمونہ کلام:

پہلے روتے تھے نہ تھا کوئی ٹھکانہ اپنا
اب تو اس بات کا رونا ہے کہ گھر رکھتے ہیں

ہم کو معلوم ہے معلوم ہمیں کچھ بھی نہیں
بے خبر رہ کے بھی ہم سب کی خبر رکھتے ہیں

ابھی تک بہہ رہا ہے کیا وہ دریا
مجھے جسکی روانی کاٹتی ہے

کبھی میری کبھی اُن کر بہو کی
مِری ماں زندگانی کاٹتی ہے

کئی کردار ہوتے ہیں کہ جن کو
کبھی خود ہی کہانی کاٹتی ہے

کچھ اک دن سے عجب حالت ہے مِری
کوئی وحشت پرانی کاٹتی ہے

محرّم جب بھی آتا ہے میرے گھر
یہ بستی میرا پانی کاٹتی ہے

محتشم احتشام بھٹ

۴۵۔مغل فاروق پرواز

۱۹۷۱ تا ۲۰۲۱ عیسوی

مغل فاروق پرواز کا تعلق پونچھ سے تھا۔مغل فاروق پرواز کے اشعار سلاست اور روانی میں ظفر اقبال کی یاد دلاتے ہیں۔"دہلیز" ادبی جریدے کے مدیر تھے. افسوس عمر نے وفا نہیں کی انکی بے موقع وفات سے پونچھ کی سر زمین کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔مرحوم موقر جریدے" دہلیز" کے چیف اڈیٹر تھے اور ایک شمارہ میں ظفر اقبال کی ۱۱۰ غزلیات کا انتخاب بھی شامل کیا ہے۔فاروق پرواز اور لیاقت جعفری اردو کے قد آور اور تنومند شاعر ظفر اقبال سے بیحد متاثر ہوئے ہیں۔ظفر اقبال کے رنگ میں بعض اشعار اور غزلیں ملاحظہ کریں۔

پرتوِ ہر چہرۂ بے چہرگاں ہے آئنہ
میں اگر آنکھیں نہ موندوں تو کہاں ہے آئینہ

آئینہ در آئینہ در آئینہ کچھ عکس تھے
داستاں در داستاں در داستاں ہے آئینہ

میرے ہونے میں میرا ہاتھ کہاں سے آیا
آج پھر مسئلہ ذات کہاں سے آیا

دہلیز کے ۳ / ۴ شمارہ میں ایک غزل جو انہوں نے چھوٹے بھائی زمرد مغل کی نذر کی ملاحظہ کریں:

ز ہے نصیب اندھیروں میں نور جاگے گا
کسی وجود میں کچھ تو ضرور جاگے گا

اسی سے چاروں طرف پھر سے روشنی ہوگی
وہ ایک لفظ جو بین السطور جاگے گا

کوئی سوال کہیں محوِ اضطراب ہے کیا
کوئی جواب جو لفظوں سے دور جاگے گا

تمام شہر کا نقشہ بدل کے رکھ دے گا
وہ ایک خواب جو زخموں سے چور جاگے گا

کسی نے آنکھوں کو اپنی ضرور موندا ہے
کوئی تو نیند سے اپنی ضرور جاگے گا

○

وہ پہلی بار جو دیکھا نہ تھا دکھائی دیا
پھر اس کے بعد کوئی نور سا دکھائی دیا

وہ بار بار کا دیکھا ہوا دکھائی نہ دے
کبھی کبھی تو ہمیں یوں لگا دکھائی دیا

جو ہونے والا ہے کھل کر وہ آج ہو جائے
جو ہو رہا تھا وہی کونسا دکھائی دیا

پھر اس کے بعد کبھی اس طرف نہیں دیکھا
وہ بد دماغ جہاں پر نہ تھا دکھائی دیا

وہ میری راہ سے گذرا وہ میرے پاس آیا
وہ میرے سامنے مجھ سے ملا دکھائی دیا

.....

نہیں تھا کچھ بھی مِری جان تشنگی کے بغیر
مِرے وجود میں لیکن کبھی کبھی کے بغیر

مِرا سخن ، مِرا لہجہ، ہزار معنی ہے
مِرے کہے پہ نہ جا، میری ان کہی کے بغیر

کوئی بھی مجھ میں ابھی لوٹ کر نہیں آیا
الجھ رہا ہوں اندھیروں سے روشنی کے بغیر

میں ایک ذات کو محسوس کرتا رہتا ہوں
کبھی کسی کے علاوہ کبھی کسی کے بغیر

میں جانتا ہوں کہ اب اسکے بعد کیا ہوگا
کہ ایک عمر گزاری ہے آگہی کے بغیر

فاروق مغل

اس میں کوئی شک نہیں فاروق مغل نے مختصر سی عمر میں اتنی بلند پایہ غزلیں کہہ دی ہیں انکے جیتے جی اس مخصوص رنگ میں پونچھ راجوری کا کوئی بھی شاعر ان سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ پونچھ راجوری کے اردو شعرا نے اردو ادب میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ لہذا میں سوچنے پر مجبور ہوں کہ پونچھ راجوری کو کیوں نہ دبستانِ ہمالہ کہا جائے۔ احمد شناس، فاروق مضطر، پرتپال سنگھ بیتاب، فاروق مغل خالد کرار، لیاقت جعفری اور کئی دوسرے احباب نے اسقدر خوبصورت غزلیں کہی ہیں کہ اردو ادب میں انکا جواب بھی کم ہی ملتا ہے۔ اگر کسی کو یقین نہ آئے تو وہ فاروق مغل کی یہ شاہکار غزلیں پڑھے۔

○

رات کے پچھلے پہر میں کوئی ڈر جاگے
جاگتا ہے تو مری جان مکرّر جاگے

آج کی رات کوئی ہار نہ مانے خود سے
آج کی رات کوئی اپنے برابر جاگے

آنکھ کُھل جائے تو بدلی ہوئی دنیا دیکھوں
بند آنکھوں میں وہی روز کا منظر جاگے

دیکھ کر لفظ پس لفظ صداؤں کا سکوت
زرد ہونٹوں پہ کسی بول کا منتر جاگے

اب کے ہاتھوں سے مرے کاش لکیریں پھسلیں
اور مجھ سا کوئی دن رات میں بڑھ کر جاگے

فاروق مغل بے شک یہ رنگ ظفر اقبال کا ہی رنگ ہے اور مگر فاروق مغل نے اسے فکری لمس سے ممتاز کر دیا ہے۔

○

وہی دریچۂ جاں ہے وہی گلی یارو
مگر نگاہ ارادہ بدل چکی یارو

کتاب حال کا کوئی ورق نہیں پلٹا
کتاب عہد گزشتہ بھی کب پڑھی یارو

ہم اپنے ذہن کی مایوں میں ڈھونڈیں گے
وہ ایک سال وہ اک ماہ وہ گھڑی یارو

اس ایک موڑ پہ تنہا ہمیں اکیلے ہیں
کہ پچھلے موڑ پہ دنیا بھی ساتھ تھی یارو

خدا کا شکر کہ سب خیریت سے ہے یعنی
مرے وجود میں ہلچل ہے آج بھی یارو

یہ اور بات کہ ان کو یقیں نہیں آیا
یہ کوئی بات تو برسوں میں ہم نے کی یارو
مغل فاروق پرواز

.....

۴۶۔علمدار حسین عدم

۱۹۷۵عیسوی

سرحدوں پر گولیاں چلنے سے یہ نہ سوچئے
آدمی کا آدمی سے رابطہ کٹ جائے گا

علمدار حسین عدم کا تعلق پونچھ کے نواحی گاؤں بانڈی چیچی قصبہ سے ہے۔ کلچرل آفیسر ہیں۔علم وادب کی زخدمت میں کمر بستہ رہتے ہیں۔ پونچھ راجوری

میں ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کے لئے جانے جاتے ہیں اور شعر و شاعری کرتے ہیں۔ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے کلچرل اکیڈیمی کو ذاتی شہرت کا ذریعہ نہیں بنایا۔

لوگ کہتے تھے مرنے والا ہے
یہ جو چہرہ ہے دوسرا اس کا

ہمیں پتا بھی نہیں کس کی وہ کہانی تھی
وہ اس قدر تھی نئی کہ بہت پرانی تھی

کبھی جو دیکھ لیا اس کو دیکھتے ہی رہے
وہ اپنے آپ میں ٹھہری ہوئی روانی تھی

.....

خاموشی سے جب بھی ہم دو چار ہوئے
آوازیں آواز لگانے لگتی ہیں

مجھ کو باہر جاتے دیکھ کے زنداں سے
زنجیریں طوفان اٹھانے لگتی ہیں

علمدار حسین عدم

.....

۴۷۔خالد کرار

۱۹۷۶عیسوی

شیخ خالد کرار کا تعلق سرنکوٹ پونچھ سے ہے۔شب خون تحریک سے متاثر ہیں۔جدید تر لہجہ کے شاعر ہیں سیاق پبلیکیشنز اور تفہیم سے وابستہ رہے۔ورود شعری مجموعہ شایع ہو چکا ہے اسکے علاوہ فکاہیہ مضمون کا مجموعہ'' کارِ زباں دراز ہے''مطبوعہ ۲۰۱۵ عیسوی بھی قابل ذکر ہے۔خالد کرار کی غزلوں میں سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔انکی شاعری پڑھ کر قاری یاس وحرمان کی دھند میں کھو جاتا ہے۔بعض اشعار میں فنّی صناعت کی لذت اور کیفیت تو بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے،مگر معانی قطعی نہیں ہوتے،بلکہ اشعار کی جہتیں کھلی رہتی ہیں اور یہی پہلو شعر کی خوبی شمار کیا جاتا ہے۔

کبھی تو ہیرو بناتا ہے اور کبھی جوکر
ہر ایک رنگ کے کردار میں ہے ساتھ مرے

وہ سارے خیمے لگاتا ہے پھر اکھاڑتا ہے
سرابِ منزل و آثار میں ہے ساتھ مرے

شکست و فتح جزا و سزا حساب و کتاب
ہمارے ساتھ یہ سب کچھ ادھر یہیں ہوا ہے

ہماری خاک اڑا دی گئی سر افلاک
ہمارا کوئی حوالہ بچا نہیں ہوا ہے

ان کتابوں میں بس یہی ہے کمی
زیست کم فلسفہ زیادہ ہے

○

کسی کے خواب کو احساس سے باندھا ہوا ہے
بہت پختہ بہت ہی پاس سے باندھا ہوا ہے

ہمارے تخت کو مشروط کر رکھا ہے اس نے
ہمارے تاج کو بن باس سے باندھا ہوا ہے

سیاہی عمر بھر میرے تعاقب میں رہے گی
کہ میں نے جسم کو قرطاس سے باندھا ہوا ہے

مرے اثبات کی چابی کو اپنے پاس رکھ کر
مرے انکار کو احساس سے باندھا ہوا ہے

ہمارے بعد ان آبادیوں کی خیر کیجو
سمندر ہم نے اپنی پیاس سے باندھا ہوا ہے

سجا رکھی ہے اس نے اپنی خاطر ایک مسند
مرے آفاق کو انفاس سے باندھا ہوا ہے

○

بات یہ ہے کہ کوئی بات پرانی بھی نہیں
اور اس خاک میں اب کوئی نشانی بھی نہیں

یہ تو ظاہر میں تموج تھا بلا کا لیکن
یہ بدن میرا جہاں کوئی روانی بھی نہیں

یا تو اک موج بلا خیز ہے میری خاطر
یا کہ مشکیزۂ جاں میں کہیں پانی بھی نہیں

بات یہ ہے کہ سبھی بھائی مرے دشمن ہیں
مسئلہ یہ ہے کہ میں یوسف ثانی بھی نہیں

سچ تو یہ ہے کہ مرے پاس ہی درہم کم ہیں
ورنہ اس شہر میں اس درجہ گرانی بھی نہیں

سارے کردار ہیں انگشت بدنداں مجھ میں
اب تو کہنے کو مرے پاس کہانی بھی نہیں

ایک بے نام و نسب سچ مرا اظہار ہوا
ورنہ الفاظ میں وہ سیل معانی بھی نہیں
شیخ خالد کرار

.....

۴۸۔عرفان عارف

۱۹۷۸عیسوی

عرفان عارف کا تعلق پونچھ سے ہے ۔ ہائر ایجوکیشن میں اردو کے اسسٹنٹ پروفیسر ہیں ۔ بقائے اردو تحریک کے جموں وکشمیر کے ونگ کے صدر ہیں ۔اردو کے فروغ میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں ۔حیران ہوں کہ ڈھیر ساری مصروفیتوں کے باوجود شاعری کے لئے وقت نکال لیتے ہیں ۔ عرفان عارف کئی تحقیقی مقالے سپرد قلم کر چکے ہیں اور ان کی تصنیفات وتالیفات میں ''دور افق سے پار''(شعری مجموعہ) ، اردو فکشن اور اسلم جمشید پوری کی تنقیدی بصیرت،فن تدریس اُردو منظر عام پر آچکی ہیں ۔

ستمگر کے ستم سہیے کسے کیا فرق پڑتا ہے
اندھیروں میں پڑے رہیے کسے کیا فرق پڑتا ہے

اسے تو نام پہ مذہب کے بس کرنی سیاست ہے
کسی کو بھی خدا کہیے کسے کیا فرق پڑتا ہے

عرفان عارف

○

ہر طرف نالہ و بکا کیا ہے
کیا ہوا ہے بھلا ہوا کیا ہے

کون منصف ہے طے جو کرتا ہے
کیا ہے اچھا یہاں برا کیا ہے

درمیاں رہ کے تم نہ سمجھو گے
ابتدا کیا ہے انتہا کیا ہے

جیتے رہتے ہیں مرتے رہتے ہیں
عشق والوں کی یہ ادا کیا ہے

مٹ ہی جائے گا ایک دن سب کچھ
آنکھ میں پھر غرور سا کیا ہے

دشمنوں میں گرے یہ سوچتے ہیں
دوستی نام کی بلا کیا ہے

ان کو عرفان سے شکایت ہے
یہ بتاتے نہیں خطا کیا ہے

○

چلو راحت ہے دنیا میں ابھی ایمان باقی ہے
ہزاروں وحشتوں کے درمیان انسان باقی ہے

مچلتا ہے یہ دل اب تک تری یادیں بھی ہیں زندہ
ابھی میں مر نہیں سکتا ترا ارمان باقی ہے

تری خوشبو ہے سانسوں میں تری آہٹ ہے ہر دھڑکن
مرے اس جسمِ فانی میں ترا سامان باقی ہے

مجھے آئینہ دو میں بھی تو دیکھوں کون ہے مجھ میں
میرے چہرے پہ کس کی اب تلک پہچان باقی ہے

مٹانے آئیں گے وہ اور تھک کر لوٹ جائیں گے
کہ سچ قائم رہے گا جب تلک عرفان باقی ہے

عرفان عارفؔ

.....

۴۹۔سلیم جاوید قریشی (سلیم تابش)

۱۹۷۳عیسوی

سرنکوٹ کے ہونہار نوجوان شاعر ہیں ۔خداداصلاحیتیں رکھتے ہیں ۔حسن خلق کی دولت سے مالال ہیں ۔موصوف نے شاعری میں عصری مسائل اور گھریلو زندگی اور دیگر معاملات کو بیان کیا ہے۔سلیم تابش کا کلام ادبی مجلوں اور اردو اخباروں میں شایع ہوا ہے۔

نمونہ کلام

جن سے آتی ہو فقط بغض و انا کی بد بُو
پھر وہی رشتے نبھاتے ہوئے ڈر لگتا ہے

تعلق اب پرانا ہوگیا ہے
اسے دیکھا زمانہ ہوگیا ہے

چھڑاتا ہے جھٹک کر مجھ سے پلّو
مِرا بچّہ سیانا ہوگیا ہے

.....

۵۰۔سردار جاوید خان

۱۹۸۰ عیسوی

سردار جاوید خاں کا تعلق نڑول مینڈھر سے ہے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے سیاسات اور قانون کی ڈگری کے بعد وکالت پیشہ سے منسلک ہیں۔ پہاڑی اردو اور گوجری میں شاعری کرتے ہیں ۔ پہاڑی شاعری کا مجموعہ "مٹی" منظر عام پر آچکا ہے ۔شعر وشاعری کا شغفت رکھتے ہیں ۔اردو میں بھی خوب شعر کہتے ہیں۔

نمونہ کلام

پھول پتے بہار کیا معنیٰ
بن تمہارے سنگھار کیا معنیٰ

میری آنکھوں میں دھول رہتی ہے
اُس کے رخ پر نکھار کیا معنیٰ

تو نہ آئے گا میری سمت کبھی
اب ترا انتظار کیا معنیٰ

سردار جاوید خان

.....

۵۱۔عمر فرحت

۱۹۸۶ تا عیسوی

یہ فخر کی بات ہے کہ عمر فرحت، خطۂ پیر پنجال سے تعلق رکھنے والے پہلے اردو شاعر ہیں جنہیں بھارت کا اعلیٰ ترین ادبی اعزاز (ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ) حاصل ہوا ہے۔

عمر فرحت کا تعلق راجوری شہر سے ہے۔معیاری جریدہ تفہیم کے مدیر ہیں۔کم عمری میں کافی ادبی کام کر چکے ہیں۔''زمین زاد''اور''سرِ شاخِ تمنّا''دو شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ یہ کیا کم ہے کہ عمر فرحت نو عمری میں بڑے لوگوں مثلاً گوپی چند نارنگ، ظفر اقبال، شمس الرحمٰن فاروقی، نظام صدیقی، کرشن کمار طور کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔میرے خیال میں ایسے حضرات کی رسائی واقعی ان کے شہرت کے معاملہ میں سرخاب کا پر ثابت ہوا ہے۔نمونۂ کلام:

تمہارے عشق میں بیمار کر دیا گیا ہوں
میں اپنے آپ پہ دشوار کر دیا گیا ہوں

بہت سے لوگ مرا سایہ بانٹنے لگے ہیں
میں راہ میں تری دیوار کر دیا گیا ہوں

○

مکمل خواب دیکھا جا چکا ہے
اندھیرا نیند سے اکتا چکا ہے
زمیں پر زندہ لاشے پھر رہے ہیں
جنوں انسانیت کو کھا چکا ہے

کھل اٹھتے ہیں کسی کو دیکھ کر ہم
وگرنہ کب کا دل مرجھا چکا ہے

کہاں ہے دشت میں وحشت سرائے
مجھے مجنوں پتہ سمجھا چکا ہے

محبت بین کرتی پھر رہی ہے
مرا دشمن مجھے دفنا چکا ہے

○

یار صحراؤں کی آنکھوں میں سمندر بھی نہ تھا
سامنے گھر کے مرے اور کوئی گھر بھی نہ تھا

کس طرح تجھ سے بھلا ملنے کی صورت بنتی
میری قسمت میں ترے وصل کا زیور بھی نہ تھا

کس طرح اڑنے کی امید پنپ سکتی تھی
آسمانوں پہ محبت کا کوئی پر بھی نہ تھا

میں پگھل جاتا محبت کے حسیں شعلے سے
پر مرے سامنے وہ موم کا پیکر بھی نہ تھا

دہر میں اب میں بھلا کس کی نمائش کرتا
اب وہ باہر ہے کہاں جو مرے اندر بھی نہ تھا

○

کاغذی تھیں جلا کے رکھ دی ہیں
ساری چڑیاں اڑا کے رکھ دی ہیں

تجھ کو اب دل سے دیکھنا ہے مجھے
اپنی آنکھیں چھپا کے رکھ دی ہیں

آج دیکھا ہے بے حجاب اس کو
ساری باتیں بھلا کے رکھ دی ہیں

دیکھنا ان میں خواب آئیں گے
میں نے آنکھیں سلا کے رکھ دی ہیں

صبر میرا شعار ٹھہرا ہے
خواہشیں سب دبا کے رکھ دی ہیں

.....

غنی غیورؔ کی زندگی اور تصانیف

تحریر و تحقیق: ولی محمد اسیرؔ کشتواڑی

عبدالغنی جاگل نام اور تخلص غنی غیورؔ ہے۔آپ ۱۲/ اپریل ۱۹۶۲ء کو تحصیل مینڈھر ضلع پونچھ کے گورسانی گاؤں میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد صاحب کا نام وزیر محمد جاگل تھا اور عطرہ بی بی آپ کی والدہ تھیں۔عبدالغنی نے گورنمنٹ ہائر سکنڈری سکول سرنکوٹ (پونچھ) سے میٹرک اور بارہویں جماعت کے امتحانات بالترتیب ۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۱ء میں درجہ اوّل میں پاس کئے۔ ۱۹۸۵ء میں گورنمنٹ ریجنل انجینئرنگ کالج سرینگر سے سیول انجینئرنگ میں ڈگری حاصل کرنے کے بعد کچھ عرصہ سائنس اینڈ ٹیکنالوجی میں ملازمت کی۔بعد ازاں ۱۹۹۲ میں محکمہ تعمیرات عامہ میں بطور انجینئر بن کر پونچھ، راجوری، کرگل، ڈوڈہ اور اننت ناگ اضلاع میں کام کرنے کا موقعہ ملا۔ بالآخر پی ایم جی ایس وائی ڈویژن بُدھل (راجوری) سے اپریل ۲۰۲۲ء میں سرکاری نوکری سے سبکدوش ہو گئے۔محکمہ پی۔ڈبلیو۔ڈی میں بطور ایگزیکیوٹیو انجینئر آپ کی شاندار کارکردگی کو عوامی اور سرکاری سطح پر سراہا جا رہا ہے۔غیورؔ صاحب کا کہنا ہے کہ:

''مجھے کالج کے زمانے سے مطالعہ کا شوق تھا۔انگریزی ادب پڑھتا تھا۔ ۱۹۸۵ء کے بعد میں نے اُردو اور فارسی ادب پڑھنا شروع کیا۔ میرے خیال میں اُردو میں کوئی مشہور شاعر اور فکشن رائٹر ایسا نہیں ہوگا جو میں نے نہ پڑھا ہوگا۔راشد الخیری و پریم چند سے لیکر کرشن چندر و بلراج مینرا تک سب افسانہ نگاروں کو پڑھا،کم و بیش یہی معاملہ اُردو شاعری میں بھی درپیش رہا۔ ولیؔ دکنی سے لے کر ظفر اقبال تک شعراء کے دیوان منگوا کر پڑھے، تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں ۔فارسی ادب کو بھی کھنگالنے میں مصروف ہوں روز بہ روز میرا سفر کسی نئی وادی میں ہوتا ہے''۔

ان کی مطبوعہ کتابوں کے نام اس طرح ہیں ۔سروش (۲۰۱۴ء) تن ورق تحریر (۲۰۱۷ء)، حکایت نیم شب (۲۰۱۶ء)، نقش دگر (۲۰۱۸ء) دیر تک (۲۰۱۹ء) محیط بے ساحل (۲۰۲۰ء) نئی اردو شاعری (۲۰۲۱ء) قلم قلم روشنی (۲۰۲۲)،سعدی سخن و قلم (۲۰۲۲ء)،نرگس شہلا (۲۰۲۳ء)،دستور زبان محلی گوجری (۲۰۲۳ء) اور آزار جاں (۲۰۲۳ء) عنقریب ہی ان کی چند اور کتابیں بھی شائع ہونے کی امید ہے۔کتابوں کے عنوانات سے پتہ چلتا ہے کہ غنی غیورؔ شاعر، افسانہ نگار، محقق، مضمون نگار اور نقاد کی حیثیت سی شعر و ادب کی نمایاں خدمت کر رہے ہیں۔

''حکایت نیم شب''،غنی غیور صاحب کے افسانوں اور کہانیوں کا عمدہ مجموعہ ہے جو ۲۱۰ صفحات پر شائع ہوا ہے۔انھوں نے اس کا انتساب ہر

دلعزیز افسانہ نگار مشرف عالم ذوقی کے نام کیا ہے۔ لگتا ہے کہ مصنف نے چھاپنے کے لئے مواد کی روانگی سے پہلے اسے اچھی طرح نہیں دیکھا ہے۔ بہر حال یہ تکنیکی کوتاہیاں کتاب کے حُسن پر کوئی نمایاں منفی اثرات نہیں ڈالتی ہیں ان کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس کتاب کی کتابت چھپائی وغیرہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ موضوعاتی رنگا رنگی غیور کی تحریروں کو خوشنما بنا رہی ہے جن کو پڑھ کر ان کی باریک بینی، ہوشیار مغزی اور فنکاری کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ اُردو زبان و ادب کے ساتھ انھیں فطری لگاؤ رہا ہے جس کا ٹھوس ثبوت اس مطبوعہ مجموعے کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

کتاب کا دیباچہ نعیم بیگ صاحب (لاہور) نے ''مژدۂ بہار'' کے عنوان سے ۵ رجون ر ۲۰۱۶ء کو قلمبند کیا ہے۔ صاحب وصوف نے لکھا ہے کہ:

''غنی غیورؔ صاحب کا فنکارانہ شعور گہرا اور مشاہدے کی قوت اتنی سیماب صفت ہے کہ ان کا ادبی وجدان فوراً ہی اُن کے مشاہدات اور فہم و فکر کو داستانوی علامتی روپ میں ڈھال دیتا ہے۔ شاید یہی وجہ رہی ہو کہ غنی غیورؔ کے ہاں موضوعات کا متنوع ہونا کوئی اچنبھا نہیں۔ ان کے حکایتی افسانوں اور کہانیوں کا مجموعہ ''حکایت نیم شب'' اپنی ادبی روایتوں کا امین ہوتے ہوئے کائنات کی عقدہ کشائی میں جتنا ممد و معاون نظر آتا ہے مجھے اس کا اعتراف بھی کرنا ہے۔ (ص ۹ :)

''حکایت نیم شب'' کے پیش لفظ میں غنی غیور رقمطراز ہیں کہ:

''مجھے لکھنے پڑھنے شعر وشاعری کا شوق والد مُشفق سے ملا اور اپنی مہربان والدہ سے سخاوت و رحمدلی ملی۔ میرا تعلق گاؤں کے متوسط خاندان سے ہے۔ لیکن میری ہنسی مذاق نے مجھے کبھی غربت کا احساس نہیں ہونے دیا اور اچھے عہدے پر فائز ہوتے ہوئے کوشش کے باوجود اتنا امیر بھی نہیں ہو سکا ہوں کہ اپنی ہنسی مذاق کو روک پاؤں یا مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوئی ہو۔ لوگ میری زندہ دلی کا ثبوت میری ہنسی مذاق کو سمجھتے ہیں اور میری ہنسی کے شواہد منفرد انداز بیان ومخصوص طرز تحریر کو۔ مائنگر وفکشن اردو ادب میں نئی نئی وارد ہوئی ہے اگر اس کے بانیوں مبانیوں کے ساتھ میرے نام کو بھی جوڑ نا چاہیے تھا۔ سید تحسین گیلانی اور دیگر ساتھیوں کے ساتھ ساتھ میں پیش پیش رہا ہوں اور آگے بھی یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ یاد رہے مائکروفکشن بنیادی طور پر مختصر افسانہ یا شارٹ سٹوری ہے۔ اسے آپ ویری شارٹ سٹوری بھی کہہ سکتے ہیں۔ نقادوں کے مطابق جدید مختصر کہانی کا اُفق ''دانشوری اور کہانی کا خوبصورت امتزاج'' دریافت ہو چکا ہے''۔ (ص ۱۴ :۔ ۱۵)

پیش نظر مجموعے کی پہلی کہانی ''مقدم کالو'' طویل ترین ہے جسے پندرہ قسطوں میں لکھا گیا ہے۔ ''کھکھار چوھڑا'' ''چلے کش فقیر'' اور ''اونٹ'' اور گیدڑ کی کہانی'' بالترتیب دو اور تین قسطوں میں تحریر ہوئے ہیں۔ کُل ملا کر ''حکایت نیم شب'' میں ۲۳ کہانیاں، افسانے، اور مائکروف فکشن پڑھنے کے لئے دستیاب ہیں۔ ہر تحریر گہرے مطالعے کا تقاضا کرتی ہے اور بعض اوقات تخلیق

کار کی بات کی تہہ تک پہنچنے کے لئے دماغ بھی دوڑانا پڑتا ہے۔ زنانہ تکرار، گھورے پر اُگے ہوئے پھول، بچے دیواروں پر چلتے ہیں، کاکروچ، خوفناک آوازیں، رات اور بھوت، مامتا، فرط محبت و اموت، سُرخ سوالیہ نشان اور رات اور بھوت اس مجموعے میں شامل مائکروف و یا خاص مائکرو فکشن ہیں جبکہ مقدمہ کالو، چاندنی، ایئر بڈز، پچھلا حساب، شربتی کی روح، دو مغرور لڑکے، سرمد کا قتل، صوفی کی موت، پنجرے کا قیدی، سائیں نیلا اور سیلاب زدہ بستیاں'' حکایت نیم شب'' کی کہانیاں اور افسانے ہیں۔ مقدم کالو، کھکھا چوھڑا، چلے کش فقیر اور ریچھ کا بچہ، بلی کا اشتہار اور اعلان حج اور اونٹ اور گیدڑ کی کہانی ''اس مجموعے کی طویل ترین کہانیاں ہیں جن کا تخلیق کار کی زبان و بیان پر مکمل گرفت اور فکشن نگاری کے ہُنر قاری کو خاص طور پر متاثر کرتے ہیں۔ ''سیکنڈ ڈویژن'' افسانے کو مختصر افسانے کے زمرے میں رکھا گیا ہے۔ ان کہانیوں، افسانوں، مختصر افسانوں اور مائیگرو فکشن کو قلمبند کرتے کرتے فکشن نگار ہے اور زبردست عرق ریزی کی ہے اور وہ اپنے مقصد میں کافی حد تک کامیاب بھی نظر آتا ہے۔ اُن کی محنت رنگ لائی اور برصغیر کے چند برگزیدہ قلمکاروں نے ان کی تحریروں کو سراہتے ہوئے کچھ اس طرح زبان قلم کو وا کیا ہے۔

''نہ یہ افسانچے ہیں نہ مائکروفکشن۔ یہ زندگی کی لہروں
پر ہچکولے کھاتے جگمگاتے شکارے ہیں''۔

(مشرف عالم ذوقی)

''آوارہ گدھا اور مقدس بیل'' عمدہ کہانی ہے، حیوانی و انسانی نفسیات کا موازنہ کامیابی سے کیا اور وہ بھی کمال روانی سے''۔ (ڈاکٹر افتخار الحق۔لاہور)

''چلے کش فقیر اور ریچھ کا بچہ'' خوبصورت علامتی افسانہ ہے''۔ (بشریٰ خاتون لاہور)

''بلی اور چوہوں کی علامت میں مصنف نے عصری علاقائی جبر و استبداد اور مظالم پر جو تصویر کھینچی ہے وہ قابل ستائش ہے''۔ (نعیم بیگ لاہور)

''حکایت نیم شب'' کے افسانوں اور کہانیوں میں رومانی عنصر نہ ہونے کے برابر ہے تاہم طنز و مزاح ان کی روح ہے۔ افسانہ نگار خود لب بستہ رہ کر اوروں کو ہنسانے کا خوب ہُنر رکھتا ہے۔ جانوروں کی نفسیات کی بات کرتے کرتے انسانی نفسیات تک پہنچ جاتا ہے۔ طرز تحریر منفرد اور اچھا ہے۔ اختصار اُن کو کافی محبوب ہے اور ان گنتی کے چند افسانوں میں اُس نے حقیقی زندگی اور چلتے پھرتے انسانوں کے ان گنت راز ملفوف انداز میں کھولنے کی بھر پور کوشش کی ہے۔ قدرتی مناظر چرند پرند، حیوانات اور زمین پر آئے روز برپا ہونے والے ہنگامے انھیں کافی پسند ہیں، وہ یہ زبان جانوروں اور پرندوں کی بات بتاتے ہوئے عصری رنگ و روپ پیش کرنے میں دلچسپی

لئے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔ مائنکر وفکشن میں غنی غیورؔ کی فنکاری کے تقریباً سبھی اوصاف نمایاں ہو جاتے ہیں ۔ یہ سیماب صفت تخلیق کار ایک کام کو مکمل کرنے کے ساتھ ہی دوسرے کام کو ہاتھ میں لے لیتا ہے ۔اسی وجہ سے اُن کے خیالات میں پختگی اور تحریر میں خوبصورتی آرہی ہے ۔

بات کو سمیٹے ہوئے ہم ''حکایت نیم شب'' کی تخلیقات سے لئے گئے مندرجہ ذیل اقتباسات پر نظر ڈال کر دیکھ لیں گے کہ غنی غیورؔ کس طرح اپنا مافی الضمیر صفحہ قرطاس پر پیش کرتے ہیں:

''مقدم کالو بڑے ہی خاص شخصیت کے مالک تھے ۔ بڑے متین سنجیدہ قرآن وسنت کے پابند تھے ۔ وہ عمدہ قسم کے لباس پہن کر اللہ کی وسیع نعمتوں کا اعلان کرنے میں مشغول رہتے تھے ۔ان کی جین کی چستی لڑکیوں کی توجہ کا مرکز بنی رہتی تھی ۔ان کی لمبی داڑھی پر میں نے کئی نظمیں لکھیں لیکن پکے اہل حدیث ہیں داڑھی کو قینچی نہیں لگاتے ۔اُن دنوں اُن کی داڑھی اُن کی ناف سے ہوتے ہوئے براستہ خاص گھنٹوں تک چلی جایا کرتی تھی''۔(کالو مقدم ۔ص ۱۸ :)

''لیاقت کئی سال نازیہ کی چکر میں پڑا رہا،لیکن پھر بھی سالہا سال پانی میں پڑے رہنے کے باوجود نرم نہیں ہوا، نازیہ بھی امیری کے نشہ میں رہی اور وہ لیاقت کی محبت اور ذہانت سے ذرا بھر متاثر نہ ہوئی اور آخر کار غریب جان کر اسے مسترد ہی کر دیا۔لیاقت نے جیسا کیا ویسا ہی پایا۔لیاقت کو دوبارہ

پٹری پر چڑھنے میں کئی سال لگ گئے ۔ جب اس کا ہوش ٹھکانے پر آیا تو اُسے نازیہ کا خیال آیا لیکن بہہ چکا وقت کا دریا کبھی پیچھے نہیں مُڑتا۔ اب نازیہ کسی حویلی کی زینت بن چکی تھی اور دو تین بچوں کی ماں ۔ بیچارے شکستہ دل بے روزگار لیاقت کے پاس صرف حسرتوں کی ایک بڑی پوٹلی کے علاوہ ایک ڈگری تھی وہ بھی سیکنڈ ڈویژن میں''۔(ص ۸۶ :۔ ۸۷)

''انسانی معاشرے کو ذات پات نے زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ ہندوستانی سماج میں منوسمرتی کے مطابق سماج چار ذاتوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ برہمن کو برہما کے منہ سے، کھشتری کو بازو سے، ویش کو پیٹ سے اور شودرا کو چرنوں یعنی پاؤں سے۔ اس ذات پات نو کے نظام نے ہزاروں سال انسانیت کی دھجیاں اُڑائیں''۔(کھکھا چوھڑا۔ص ۸۷ :)

''گلیاں سڑکیں اور کھلی جگہیں جھیل کی طرح بن گئی تھیں۔ اسی اثنا میں مُسلح اشخاص کشتیوں میں بیٹھے ہوئے نمودار ہوئے۔ لاگ امداد اور نجات کے لئے چیخنے لگے لیکن جہاں کہیں سے ان کی آواز آئی تھی وہاں ٹھس کی آواز آتے ہی ارد گرد کا پانی تھوڑی دیر کے لئے لال سُرخ ہو جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ چیخ و پکار فریاد اور امداد طلب کرنے والی آوازیں بند ہو چکی تھیں اور جہلم کے مٹیالے پانی میں انسانوں کے خون کا رنگ و ذایقہ شامل ہو چکا تھا''۔(سیلاب زدہ بستیاں۔ص ۱۳۰)

''میں نے کتے اور گدھوں کے سروں والی ٹرے یوں کا پیچھا کیا.....

اور دیکھا کہ ایک بڑے تھیٹر میں بیک وقت کئی لیڈروں کی کھوپڑیاں کھولی گئی تھیں ساتھ ہی ساتھ کتوں اور گدھوں کی کھوپڑیوں سے مغزوں کو نکال کر مہارت سے ان میں منتقل کئے جارہے تھے ۔کھوپڑیاں بدلتے وقت ضرور کوئی غلطی صادر ہوئی ۔اُس دن سے لیکر اِس دن تک شاہی ایوانوں میں مسلسل بھوں بھوں اور ڈھینچوں ڈھینچوں کی خوفناک آوازیں سُنائی دیتی ہیں''۔(خوفناک آوازیں ۔ص ۱۱۹ :۔ ۲۰۰)

''گویا ہر پھیلنے والی وبا ایک دن اپنے ہدف کو چھوڑ کر یا ساتھ لیکر ختم ہو جاتی ہے لیکن ایک زنانہ بحث وتکرار ہے جو کوئی بھی موسم ہو کبھی ختم نہیں ہوتی''۔(زنانہ تکرار ۔ص ۲۰۳:)

مجموعی طور پر''حکایت نیم شب'' پڑھنے کے لائق کتاب ہے جس کا مطالعہ کرنے کے بعد میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کی غنی غیورؔ ایک سنجیدہ اور چاک و چوبند افسانہ نگار اور کہانی کار ہیں ۔انھیں اپنے اندر موجود ساری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر مزید افسانے اور کہانیاں لکھنے کا مخلصانہ مشورہ ہے۔

''سروش''،غنی غیورؔ کا ایک ہاڑ دبونڈ عمدہ ضخیم شعری مجموعہ ہے جو ۲۰۱۴ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا تھا،۱۹۰ صفحوں پر چھپے ہوئے اس مجموعے کا بیک پیج شیخ خالد کرار نے تحریر کیا ہے۔انھوں نے لکھا ہے کہ:

''غنی غیورؔ کی غزل فکر کی گہرائی کے علاوہ تصوف اور فلسفہ کی رنگ آمیزی سے عبارت ہے۔ان کی غزل میں کائنات ایک دریچہ ہے جس سے

حرف ،قوافی اور قواعد کے ساتھ جھانکتے ہیں ۔ان کے یہاں عشق و آگہی کے مضامین روایت سے قطعی مختلف انداز میں اختراع ہوئے ہیں''۔ دیباچہ رفیع رضا نے لکھا ہے جو کینیڈا میں مقیم ہیں ۔ رضا نے اپنے مفصل تاثرات کے بجائے غیورؔ کے کئی شعری نمونے دیتے ہوئے بتایا ہے کہ: ''غنی غیورؔ کی شاعری میں مجھے امید نظر آتی ہے کہ وہ بالآخر جگالی زدہ شاعری سے پرے اپنا راستہ چُنیں گے۔ میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ شعریت کے بغیر لفظی و عروضی وزن پورا کر دینے سے کوئی شاعری نہیں مگر بدقسمتی سے ۹۹ فیصد اردو شاعری محض وزن پورا دینے والی شاعری ہوتی ہے۔غنی غیورؔ کو اپنے لہجے کی جدّت کا احساس ہے۔ان کے یہاں دلچسپ صورت حال یہ ہے کہ اُن کا لہجہ گجرات کے ظفر اقبال یعنی عادلؔ منصوری سے ملتا جلتا ہے۔گویا ظفر اقبالؔ ، عادل منصوریؔ اور غنی غیورؔ کی تکون مکمل ہوگئی ہے''۔(ص ۸ :۔۱۰)

سروش میں ۲ دعا ایک مناجات ۲ نعت ۱۲۵ غزلیں ۱۰ نظمیں ۱۸ قطعات ۹ فردیات اور ۱۲ متفرقات ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اُردو شاعری کے تقریباً سارے اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔کتاب میں شامل تخلیقات کو دیکھ کر اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ غنی غیورؔ افسانہ نگاری کے مقابلے میں شعر و شاعری کی کافی خدمت کر رہے ہیں ۔اگر چہ ''سروش'' ان کی ابتدائی شاعری کا ہی مجموعہ ہے تاہم اس میں موجود کلام سے یہ اندازہ لگایا جانا آسان ہے کہ وہ شاعری کے میدان میں ایک ممتاز و معتبر

شاعر بننے کی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں ۔ روایت کی پاسداری کرتے ہوئے وہ مابعد جدید اُردو شاعری سے بھی متاثر ہیں جو اُن کے شاعرانہ لب و لہجے سے ظاہر ہے ۔

غنی غیور بھی دیگر عام شعراء کی طرح ہی زیادہ تر غزل کے عاشق ہیں ۔ وہ اس اپنی محبوب صنف سخن کا لسانی ، معنوی ، اصطلاحی اور ترکیباتی اعتبار سے کو خوبصورت سے خوبصورت ترین بنانے کی حتیٰ الوسع کوشش کر رہے ہیں ۔ ان غزلوں میں روایت اور جدت کا ایک حسین امتزاج موجود ہے ۔ انھوں نے فارسی جانتے ہوئے بھی فارسی کے بھاری اور غیر مناسب الفاظ و اصطلاحات کو برتنے سے ہر ممکنہ احتراز کیا ہے ۔ موضوعی اعتبار سے یہ غزلیں رنگین و پُر اثر ہیں ۔ کبھی کبھی اُن غزلوں میں آپ بیتی ، جگ بیتی اور حسب حال ایک جگہ جمع ہو کر ان کے اشعار کو خوبصورت اور خوشنما بناتے ہیں ۔ مظلموں ، محکوموں ، غم زدوں اور بے کسوں کی صورت حال دیکھ کر وہ سیخ بہ پا ہو جاتے ہیں اور طنز و مزاح کا لہجہ اختیار کر کے وہ بڑی تڑپانے والی باتیں کرتے ہیں ۔ ان کی غزلوں سے لئے گئے درج ذیل شعروں میں ان کی غزلوں کی ماہیئت ، اثر آفرینی اور مقبولیت عیاں ہو جاتی ہے جو قابل غور ہے ؎

یہی جاگیر ہے فقیروں کی
باعثِ فخر و صد غرور ہے عشق

ہم بھی ٹھہرے قصوروار غنیؔ
عشق پیشہ ہیں اور قصور ہے عشق

بہہ رہا ہے امان و امن کا خوں
کیوں یہاں کوئی مہرباں روتا

سارے پنچھی چلے کسی جانب
صبحِ ویراں پہ ہے سماں روتا

اس کو بیساکھیوں پہ فخر تھا کاش
اپنی ٹانگوں پہ وہ چلا ہوتا

ملی ہوتی نجات اس کو بھی
ذات حق میں اگر فنا ہوتا

رات دن محو ہیں تلاوت میں
رُخ ترا بھی کھلی کتاب ہوا؟

میرؔ صاحب بھی کھا گئے دھوکہ
اُن لبوں سا کہاں گلاب ہوا؟

رُخ پہ اُس کے وہ بکھرنا زلف کا
ایک مدت ہو گئی دیکھے ہوئے

اُون مشکل کاتنی تھی عشق کی
مشکلوں سے معتبر دھاگے ہوئے

آدمی سب کے سب برابر تھے
لوگ کیوں امتیاز کرتے رہے

لوگ سُن کر کہاں تھے راضی
شعر نذرِ بیاض کرتے رہے

جامہ تھا وہ غریب لڑکی کا
سی رہی وہ اُدھڑ گیا دیکھو

کھوکھلے پیڑ کا بھروسہ کیا
وہ جڑوں سے اُکھڑ گیا دیکھو

کنبہ اک ہی تو تھا بنی آدم
اُن کے پھر خاندان تھے کیا کیا

غنی غیورؔ کی غزلوں میں تصوف کا رنگ بھی خوب جھلکتا ہے۔ موحد و مومن تو

ہیں ہی حُبِ اولیاء اور رغبت تِصوف سونے پر سہاگہ کا کام کر گئے ہیں ۔اس ضمن میں ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

پتھروں کی بارش ہوتی رہی ہے پھر بھی
زندہ ہے زندہ رہے گا وہ مرتا نہیں

سر بلندی ہو گئی ان کو نصیب
جاگتے رہتے تھے جو راتوں میں لوگ

رات دیکھی نہ دن قلندر نے
نا مرادوں کو با مُراد کیا

نام ہو جائے گا ترا نابود
مت اُلجھنا قلندروں سے دیکھ

غنی غیورؔ کے شامل کتاب قطعات میں کچھ چھوٹے اور کچھ بڑے قطعے شامل ہوئے ہیں جو فنی موضوعی اور معنوی اعتبار سے شاعر کی خوش بیانی کے اچھے نمونے ہیں ۔مثال کے طور پر یہ قطعات۔

میرے ماں باپ آسرا میرا
کم تھا لوگوں سے رابطہ میرا

ہم جو خانہ بدوش کنبے ہوئے
کب ٹھکانہ تھا اک جگہ میرا

گرمیوں میں پہاڑ پر ڈیرا
سردیوں میں نشیب تھا میرا

چائے کی پیالی روٹیاں اک دو
مل ہی جاتا تھا ناشتا میرا

میرا اسکول بھی ''مُبائل تھا
در بدر وہ ، قبیلہ تھا میرا

کوئی تاریخ کے ورق پلٹے
کوئی کربل کا واقعہ دیکھے

حق کی آواز کی بلند، کوئی
ابن ِ حیدر ؓ کا مرتبہ دیکھے

تجھے دل بے تحاشہ چاہتا ہے
تعلق یہ بنانا چاہتا ہے

کوئی جاتا نہیں تفصیل میں اب
جسے دیکھو خلاصہ چاہتا ہے

درختوں سے مراسم بڑھے ہیں
پرندہ گھر بسانا چاہتا ہے

''سروش'' کی ایک نظم کافی دلکشی کا باعث بنتی ہے جو اس طرح ہے۔

بہت نم دار ساون کا مہینہ
بدن سے اس کے بہتا تھا پسینہ

ڈھلی چھاؤں وہ بچی پھر وہیں تھی
میسّر اس کو چھتری نہیں تھی

مِری آنکھوں میں ہے اب تک وہ منظر
وہ ننّھی بچّی وہ گرمی ، وہ پتھر

کوئی اس کا وسیلہ کچھ نہیں کیا
کسی کا بھی فریضہ کچھ نہیں کیا

وہ چہرہ پھول کی مانند کھلتا
اُسے پُرسانِ حالِ زار ملتا

اس نظم کی طرح ہی مزدور (ایک منظر) اور پیشہ ور بھی بڑی پُر اثر نظمیں ہیں۔ جن کی بنا پر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ غیور نظم نگاری کی جانب بھی اگر تھوڑی اور توجہ دیتے تو وہ اچھے نظم نگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ غیورؔ کے عقیدتی اشعار بھی کسی طرح کم نہیں ہیں مثلاً یہ شعر۔

شمع غم کی بھی جلتی رہے
روشنی دل کی بڑھتی رہے

سبز ہوں ذہن کی کھتیاں
غم کی بارش برستی رہے

فکر کی دھوپ ہو بارہ ماہ
شعر کی فصل پکتی رہے

بھائی چارہ ، محبت بھی ہو
رشکِ فردوس دھرتی رہے

اُن کا ثانی ما سوا اُن کے نہیں
کب خلیلؑ ان سا ہوا یا پھر کلیمؑ

جس نے دیکھا ان کو دیکھا خوب تھا
اُن کا اسوہ ، اسوۂ ربِّ کریم

اپنا ہی عکس اُس کے تھا پیشِ نظر
ورنہ کب انساں ہوا اُن سا فہیم

مجموعی طور پر غنی غیور کا مجموعہ کلام ''سروش'' اُن کے تابناک شعری مستقبل کا آئینہ دار ہے۔اس پہلے ہی شعری مجموعہ میں چونکانے والے شعر جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں۔مثلاً ؎

اپنی بیٹی پہ مجھ کو بڑا فخر ہے
جانے کیا گُل کھلائے گا بیٹا میرا

کامیابی کی شرط ہے اخلاص
کام اخلاص کے بغیر نہ کر

''قلم قلم روشنی''غنی غیور کا دسرا شعری مجموعہ ہے جو سال ۲۰۲۲ء میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔ایک سو بارہ صفحات پر پھیلے ہوئے اس مجموعہ کلام میں ۹۵ غزلیات اور پندرہ متفرقات شامل ہیں۔یہ مجموعہ پیپر بیک ہے اور اس کا بیک پیج لاہور کے ظفر اقبالؔ صاحب نے قلمبند کیا ہے۔صاحب موصوف نے لکھا ہے کہ:

''جدید شاعروں کے یہاں تنہائی ایک مرکزی تصور رہا ہے۔غنی غیور کے یہاں یہ صورت اور بھی شدید ہو کر سامنے آتی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ جس طرح جدید شعراء نے وجودی فکر سے رشتہ جوڑتے ہوئے تنہائی کو

مرکزیت دے دی وہ اسی نہج پر غنی غیور کے ہاں بھی پائی جاتی ہے۔ موضوعات کی یکسانی کے باوجود غنی غیورؔ بہتوں سے الگ قسم کے شاعر نظر آتے ہیں اور یہ امتیاز بے حد اہم ہے"۔

ان تاثرات سے معلوم ہوتا ہے کہ غیورؔ نے اپنی شاعری کی بدولت ہند و پاک میں اچھا نام کمایا ہے اور وہ اپنی شناخت بنانے میں کافی حد تک کامیاب بھی ہو چکے ہیں۔ "قلم قلم روشنی" کے ابتدائی صفحوں پر حسب روایت کوئی بھی دیباچہ یا اپنی بات وغیرہ دستیاب نہیں ہے۔ کتاب کا انتساب مصنف نے اپنے تمام دوستوں" کے نام کرتے ہوئے اپنی وسیع القلبی اور اپنے دلی خلوص کا کھلا اظہار کیا ہے۔

سمندر کے شکم سے ہم نے لائے قیمتی موتی
کسے جا کر تھمائیں، تم بھی سوچو ہم بھی سوچیں گے

غنی غیور

"قلم قلم روشنی" کی غزل بھی "سروش" کی غزلوں کی طرح عمدہ اور دلکش ہیں۔ یہ غزلیں زیادہ سے پانچ سے سات اشعار پر مشتمل ہیں۔ البتہ غیورؔ نے فارسی ترکیبوں کا جی بھر کر استعمال کیا ہے۔ تاہم اس استعمال کی وجہ سے ان غزلوں میں موجود شعریت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا۔ ان غزلوں میں بھی سماج کے کمزور طبقوں اور عام غریبوں کی باتیں اُبھاری گئی ہیں۔ کہیں ساقی جام اور میخانہ کی یادیں تازہ ہوئی ہیں۔ عشق و محبت کی گتھیوں کو بھی کافی حد سے سلجھائے

جانے کی کاوشیں ہوئی ہیں۔زمینی اور آسمانی صورت حال کی بھی اچھی عکاسی ہوئی ہے۔سب سے بڑھ کر یہ کہ شاعر نے اپنے من کی بات دلپذیر پیرائے میں بیان کی ہے۔جدید شاعری کے وہ دلدادہ ہی نہیں بلکہ خدمت گار بھی ہیں۔ زبان سادہ، عام فہم اور فصیح ہے۔لگا تار مشق سخن کرنے کے نتیجے میں غیورؔ صاحب کے کلام میں روز بروز لطافت پیدا ہو رہی ہے۔ان ہی چند باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میں اپنے آپ کو یہ کہنے میں حق بجانب تصور کرتا ہوں کی'' قلم قلم روشنی'' میں شامل کیا گیا کلام گیرائی اور گہرائی کے اعتبار سے ''سروش'' میں دئے گئے کلام سے قدرے بہتر ہے۔مندرجہ ذیل اشعار کو پڑھکر آپ خود بخود تقابلی مطالعہ کر سکتے ہیں۔

رہ گئی اپنی جگہ پر جھونپڑی
پختہ گھر تھا زلزلہ میں ڈھ گیا

پیڑ پیکر، سخاوت کا غنیؔ
زخم کھا کے درد اکثر سہہ گیا

نلوں میں پانی نہیں انتظار کرنا تھا
تمہیں تو اپنے گھڑوں سے ہی پیار کرنا تھا

اگر چہ عشق میں گھاٹا بہت ہوا ہم کو
یہ پُل صراط بہر حال پار کرنا تھا

''موم جامے'' پگھل گئے رشتے
ہاتھ سے پھر نکل گئے رشتے

اک ذرا آنچ کیا لگی اُن کو
ہو گئے ڈھیر جل گئے رشتے

اس کو غزلیں سُنا رہا تھا
اور وہ لے رہی جماہی تھی

پاس اس کے ثبوت سارے تھے
ایک میں اور بے گناہی تھی

کرونا کے ایام میں تخلیق شدہ یہ اشعار، محض وقتی ردّ عمل نہیں بلکہ انسانی المیے کے آفاقی شعور کی جھلک پیش کرتے ہیں۔

پھلانگتے ہیں پرندے بھی سرحدوں کو ابھی
کھلے ہیں 'ویزے' بھی رہ داریوں کا موسم ہے

کئی دنوں سے ہوئے قید میں گھروں میں ہم
ہمارے شہر میں بیماریوں کا موسم ہے

آخری دور ہے یہی شاید
آدمی آدمی کو ڈستا ہے

آج کپڑا ہوا بہت مہنگا
آدمی کپڑے سے تو سستا ہے

دل دریچہ کُھلا رکھا میں نے
ادھر آئے کوئی حسیں شاید

چل رہا ہوں بدل بدل کے راہ
مل ہی جائے گا وہ کہیں شاید

قبر میں بے خبر پڑا مُردہ
ہم سے تو رابطے نہیں ہوتے

شہر میں جنگ کی سی حالت ہے
جنگ میں ضابطے نہیں ہوتے

خستہ چھت ہے پرانی دیواریں
خیر ہو یا خدا مکینوں کی

جب سے گھٹنے لگی ہے پیداوار
بڑھ گئی قیمتیں زمینوں کی

''محیط بے ساحل''، غنی غیور کی ایک ایسی تالیف ہے جس کو پڑھ کر اُن کی ادب شناسی، ترجمہ نگاری، تنقید نگاری اور تحقیق سے گہری دلچسپی کا راز کھل جاتا ہے۔ اس ہارڈ بونڈ اور ۱۷۱ صفحات والی کتاب کا بیک پیج عمر فرحت نے قلمبند کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

''میں اس بات کا عینی گواہ ہوں کہ پچھلے آٹھ دس سال سے غنی غیورؔ بیدلؔ کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ وہ وقتاً فوقتاً بیدلؔ کے اشعار پر گفتگو کے علاوہ مضامین بھی سپرد قلم کرتے رہے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ غنی غیورؔ نے ان بکھرے پڑے مضامین کو توضیح اور تصحیح کے بعد کتابی شکل دی ہے۔ زیر نظر کتاب میں بیدلؔ کے سینکڑوں اشعار کے تراجم نہایت سلیس اور ادبی زبان میں پیش کئے گئے ہیں۔ یقیناً اس کتاب کا مطالعہ بیدلؔ شناسی میں اہم اضافے کی اہمیت رکھتا ہیں''۔ ''کتابیات پر نظر ڈال کر معلوم ہوتا ہے کہ غنی غیورؔ نے زیر بحث کتاب کو مرتب کرنے میں ۳۳ کتابوں سے براہ راست مدد ملی ہے۔ ابتدائی صفحات پر مولف کا تحریر کردہ بصیرت و بصارت افروز مقدمہ پڑھنے کو ملتا ہے۔ جس میں یہ کتاب لکھنے کی غرض و غایت اور اہمیت کو ادبیانہ انداز میں واضح کیا گیا ہے۔ فارسی غیورؔ کا اختیاری یا نصابی زبان نہ ہونے کے باوجود اُن کی دلچسپی کا موجب رہی ہے جس کو سیکھنے کے لئے انھیں سالہا سال محنت

شاقہ سے کام لینا پڑا۔ اس لئے انھوں نے فارسی شعروں کے تراجم اور تشریحات درج کر کے اپنی فارسی دانی اور شعر شناسی کا ثبوت دیا ہے۔ اپنی کتاب کی اہمیت بیان کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ: ''امید ہے کہ میری کاوش قارئین کو پسند آئے گی اور بیدلؔ کی تفہیم آسان بنائے گی۔''(مقدمی۔ص ۱۶ :)

''محیط بے ساحل'' کی اس کتاب کے مولف نے اسے بیدلؔ شخصیت اور فن ، بیدلؔ ہندوستانی روایت کا شاعر، بیدلؔ بحیثیت فطرت نگار، تراکیب و اصطلاحاتِ بیدلؔ، شراح اصلاحات بیدلؔ، بیدلؔ و غالبؔ، مماثلت کے پہلو، تجدّد امثال، بیدلؔ کے استعارے، بیدلؔ محیط بے ساحل، بیدلؔ برگسیاں اور اقبالؔ، بیدلؔ اور اقبالؔ اور بیدلؔ، بیدل کا حرکی نظریہ، بیدل کا استعجاب و حیرت کا شاعر، کلام بیدلؔ میں ضائع و بدائع، منتخب رباعیات بیدلؔ، بیدل کی قطعہ نگاری، بیدلؔ کی منتخب غزلیات مع ترجمہ اور بیدلؔ کے منتخب اشعار مع ترجمہ کے اٹھارہ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ اس طرح سے ثابت ہوتا ہے کہ غنی غیورؔ نے بڑی عرق ریزی سے کام لیتے ہوئے میرزا بیدلؔ کی شخصیت اور شاعری کے کئی اہم پہلوؤں کا تجزیاتی اور تنقیدی مطالعہ پیش کر کے بڑا ادبی معرکہ سر کرلیا ہے۔ آج کے دور میں فارسی شاعری کو ایک نئے رنگ میں پیش کرنے کا یہ کام سراہا ہے جانے کے لائق ہے۔ کتاب سے لئے گئے یہ اقتباسات چشم کشائی نہیں انتہائی ذہانت کے آئینہ دار بھی ہیں :

''بیدلؔ کی شاعری وسیع اقلیم ہے جس میں اونچے پہاڑ ہیں، بے آب وگیاہ بیابان سرسبز وادیاں، موجزن آبجُوئیں، الغرض گوناگوں چیزیں نظر آتی ہیں''۔ (ص ۸ :) بیدلؔ ہندوستان کے اہم ترین فارسی شاعر ہوئے ہیں اور سبک ہندی کے امام، پٹنہ عظیم آباد میں میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے آباء واجداد کا تعلق ترکوں کے آرلاس قبیلہ سے تھا۔ ان کے والد سپہ گری سے وابستہ تھے بیدلؔ مختلف مقامات پر ٹھکانے بدلتے رہے۔ بالآخر دہلی میں ہی وفات پائی اور اپنے رہائشی مکان میں دفن ہوئے''(ص ۱۹ :)

''اقبالؔ کے یہاں مزدور دنیا کا ذکر بیدل سے ملتا جلتا ہے البتہ بیدلؔ نے اسے پُر پیچ اسلوب میں پیش کیا ہے جبکہ اقبالؔ کے یہاں سطحی بیانیہ کا زور و اجبار ہے اور جذبات کا شور وشغب''(ص ۲۲ :)''بیدل اپنی زبان کے خالق بھی ہیں اور موجد بھی۔ انھوں نے اپنے کلام میں بیشمار انوکھی تراکیب و اصطلاحات استعمال کی ہیں ۔ بیدلؔ برہنہ گوئی اور سہل نگاری کے بجائے معمائی لہجہ اور مشکل پسندی کے علمبردار ہیں''۔(ص ۳۵ :)''بیدل کی شاعری دشتِ حیرت ہے۔ اس میں تجلیات کی بارش ہوتی ہے ہر لحظہ میں شواہد اور نقوش شکلیں اور رنگتیں بدلتے ہیں اور ہماری حیرت میں اضافہ کرتی ہے۔ بیدلؔ کے جہاں میں ہر ذرہ محوِ دُعا ہے''۔(ص ۱۱۹ :)

''آزارجان''، غنی غیور کی تازہ ترین تالیف ہے جو سال رواں کی ابتداء میں شائع ہوئی۔ ۱۹۲ صفحوں پر چھپی ہوئی اس پیپر بیک کتاب میں انھوں

نے کافی تحقیق کر کے حکیم منظورؔ کی ایک سو ایک غزلیات جمع کی ہیں۔ جنھیں ایک پُر مغز مقدمہ کے ساتھ شامل کتاب کیا گیا ہے۔ حکیم منظورؔ مرحوم جموں و کشمیر کے ایک معتبر و مقبول شاعر ہو گزرے ہیں۔ غیورؔ نے اُن کی غزلوں کا یہ نایاب مجموعہ زیور طبع سے آراستہ کر کے ایک اور اہم ادبی کام کیا ہے جسے بجا طور پر مرحوم پروفیسر حامدی کاشمیری کے نام منسوب کر کے ایک تیر سے دو نشانے مارنے کی اچھی کوشش کی گئی ہے جموں و کشمیر میں اُردو شاعری کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے غنی غیورؔ رقمطراز ہیں:

''حکیم منظور پہلا روایت شکن اور کشمیر کا مقامی شاعر ہے جس نے اُردو شاعری میں نئے تجربے کئے۔ اُن کی شاعری تازگی سے بھر پور اور نئے انداز سے معنی آفرینی کی حامل ہے۔ حکیم منظور کے پاس ارضی عنصر نمایاں ہے حکیم منظور مخدوم محلہ زینہ کدل (سرینگر) کے حکیم علی محمد کے گھر پیدا ہوئے۔ حکیم محمد علی شادی کے بعد گوجوارہ میں منتقل ہو گئے۔ طبابت پیشہ سے وابستہ تھے اسی نسبت سے ان کے نام کے ساتھ حکیم لگا ہے۔ حکیم منظور کی والدہ کا نام صدیقہ بیگم تھا۔ حکیم منظور نے ۱۹۵۷ء میں علی گڑھ سے گریجویشن کی اور لور گریڈ کلرک کی حیثیت سے سرکاری ملازم ہو گئے۔ ذہانت اور محنت کی بدولت پرموشن پر پرموشن ملتی گئی۔ کچھ عرصہ بعد کسٹوڈین اور ڈپٹی کمشنر بنے اور بعد ازاں سیکرٹری بھی رہے اور اسی عہدے سے سبکدوش ہو گئے۔ انھوں نے ۱۹۶۴ء میں شاعری کرنا شروع کی۔ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۹۸ء تک اُن کی ۱۳

کتابیں شائع ہوئیں جن میں سے پھول شفق، آنگن اور برف آفتاب نظموں اور آٹھ مجموعے غزلوں پر مشتمل ہیں۔ ان کی رباعیات کا مجموعہ ''چہار ضرب'' ان کی وفات کے بعد ۲۰۰۹ عیسوی میں باہتمام آفاق منظور شائع ہوا ہے''۔ حکیم منظور ذیابطیس کے مریض تھے۔ ۲۱ دسمبر ۲۰۰۶ء کو اپنی رہائش گاہ گوڑ گاؤں (ہریانہ) وفات پا گئے۔ دوسرے دن ان کے جسد خاکی کو سرینگر لایا گیا اور آبائی مقبرے واقع بہاءالدین میں دفن کر دیا گیا۔(ص ۱۸:۔۲۱)

غنی غیورؔ نے حکیم منظور کو اپنی اس تالیف کے مقدمہ میں شاعر کشمیر کے نام سے یاد کر کے انھیں اور اُن کی اُردو شاعری کو بطریقہء احسن متعارف کیا ہے۔ کتاب کے دوسرے باب میں حکیم منظور کے منتخب اشعار مع اشارات کو جگہ دی ہے۔ انھوں نے بہت ہی مختصر لفظوں میں ان کے ان اشعار کی تشریح کر کے اپنی تنقید نگاری اور شعر فہمی کا کمال دکھایا ہے۔ یہ تالیف غیورؔ کی جانب سے شاعر مرحوم کو زبردست خراج عقیدت پیش کرتی ہے۔ اُردو دان طبقہ ضرور بہ ضرور اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھے گا۔

''مسعود احمد چودھری۔ شخصیت اور خدمات'' غنی غیورؔ کی ایک اور اہم تالیف ہے جو ۲۰۲۰ء میں طبع ہوئی۔ اس کا انتساب اس طرح ہوا ہے۔

''ڈاکٹر مسعود احمد چودھری کے جنت نشین والد گرامی بابو فیض احمد کے نام جن کی شفقت و محبت، لیاقت و صلاحیت و رہنمائی سے کالا بن کے اندھیاروں میں روشنی کی ایسی کرنیں پھوٹیں جن کی شعاعوں میں اُن کی آل

واولاد نے مرحوم ومغفور کے خوابوں کو پیراہن اعتبار بخشا۔

رات یوں دشت میں تم نے آواز دی
جیسے صحرا کی مسجد میں نورِ اذاں

غنی غیورؔ نے ابتداء میں اس کتاب کا نام نقش دگر (سوانح حیات) رکھا تھا جسے بدل کر ''مسعود چودھری شخص، شخصیت اور خدمات'' رکھا گیا۔اس کا پیش کلام محمد یوسف ٹینگ صاحب نے قلمبند کیا ہے۔صاحب موصوف نے لکھا ہے کہ:

''اگر میں اس کتاب کے فاضل ترتیب کار غنی غیورؔ کی عرق ریزی اور قلمی رقاصی کا ذکر کروں تو وہ ایک بڑی بے انصافی ہوگی۔وہ پیشے سے تو ایک انجینئر ہیں مگر انھوں نے اس کتاب کی تالیف میں جس خوش نظری کا اظہار کیا ہے وہ مجھے ماؤذی ٹینگ کے محاورے کے مطابق حُسن ترتیب کی عمدہ انجینئرنگ کی یاد دلاتا ہے اور اس شعر کی منطق بھی''۔

منزل کی دھن میں آبلہ پا اٹھ کھڑے ہوئے
شورِ جَرَس سے دل نہ رہا اختیار میں
یگانہ یاس چنگیزی

خود غنی غیورؔ نے ''پیش لفظ'' میں بتایا ہے کہ: ''زیر نظر کتاب مسعود احمد چودھری کی شخصیت، نظریات اور جذبات کا جائزہ لینے کی بے لوث سعی ہے۔ اس کتاب میں اُن کے احباب کا اجمالی تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔کتاب کو آخری

شکل دیتے وقت دیگر قلمکاروں کے تاثرات کے علاوہ دستاویزی شواہد اور یادگار زمانہ تصاویر کو بھی شامل کیا گیا ہے''۔(ص ۲۳ :)

غنی غیورؔ نے جن کتابوں سے استفادہ اٹھایا ہوا ہے اُن میں تاریخ اقوام پونچھ، تاریخ اقوام کشمیر، تاریخ پونچھ، تاریخ گوجر، تاریخ شاہان گوجر، حیات جاوید، حالی فہمی، تاریخ راجوری، وغیرہ خاص طور پر شامل ہیں۔ ۳۶۷ صفحوں پر چھپی ہوئی یہ ضخیم کتاب غنی غیورؔ کی شخصیت نگاری، سیرت نگاری اور نثر نویسی کا عمدہ نمونہ ہے۔آخر پر جاوید راہی کے دو خاص انٹرویو بھی شامل کئے گئے ہیں جن سے مرحوم چودھری صاحب کی زندگی کے کچھ اہم گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ نیز طالب آفاقی، محمد اسلم قریشی، خالد حسین، قدوس جاوید، ڈاکٹر کمال انجم اور عرفان عارف کے مضامین دے کر مولف کتاب کی وسعت میں نمایاں اضافہ کیا گیا ہے۔مرحوم مسعود چودھری صاحب کو ۱۵ ستمبر ۲۰۱۲ء کو بابا غلام شاہ بادشاہ یونی ورسٹی راجوری کے کنوکیشن میں یونی ورسٹی کے چانسلر عمر عبداللہ اور مہمان خصوصی این۔آر۔نارائن مورتی مہمان خصوصی نے یونیورسٹی کی جانب سے ڈی۔لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔اس موقعہ پر جو ''CITATION'' پڑھی گئی۔اس کا ایک اقتباس اس طرح ہے:

''ایک فرض شناس سوشل محرک، ایک ادارہ ساز، ایک محافظ ِماحولیات، ایک مشنری ایک حاکم، ایک ثقافتی پیامبر، الغرض کئی خوبیاں ایک سے بڑھ کر ایک سے بڑھ کر ایک بدرجہ اتم ایسی موجود ہیں جن میں امتیاز کرنا ممکن نہیں

وہ بجا طور پر صفِ اول کے نمائندہ اور حامل ہیں ۔اُن کی گوناگوں خدمات اور قربانیوں کے پیشِ نظر بابا غلام شاہ بادشاہ یونی ورسٹی انہیں نہایت فروتنی کے ساتھ ڈی۔لٹ کے اعزاز سے نوازتی ہے''۔(ص ۲۷۶ : ۔۲۷۷)

زیر بحث چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جن کے عنونات بالترتیب زیست ِمسعود بے زبانوں کی زبان ، بابِ ٹرسٹ ۔نشاۃ ثانیہ ، دانش گاہ ، پرتو سرسیّد اور پس آئینہ ۔صدائے عمر رفتہ ۔ پیغامات کے حصے میں شری این این وہرہ گورنر جموں وکشمیر ،عمر عبداللہ (وزیر اعلیٰ جموں وکشمیر) ڈاکٹر فارق عبداللہ (ممبر پارلیمنٹ) غلام نبی آزاد (مرکزی وزیر) ، ڈاکٹر کرن سنگھ (ممبر راجیہ سبھا) پروفیسر سیف الدین (مرکزی وزیر) مفتی محمد سعید (وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر) تارا چند (نائب وزیر اعلیٰ) وغیرہ کے انگریزی پیغام بھی شاملہیں جو چودھری مرحوم کی شخصیت اور خدمات کا اعتراف کرتے ہیں :

''دستورِ زبان محلی گوجری'' ۲۰۲۳ء میں شائع شدہ کتاب ہے جو ۱۶۳ صفحوں پر مشتمل ہے اس کتاب کے لکھنے میں تیرہ (۱۳) کتابوں سے استفادہ لیا گیا ہے ۔مصنف نے اس کا انتساب ''گوجر دیش چیئیر یٹل ٹرسٹ جموں کے بانی مرحوم مسعود احمد چودھری'' کے نام کیا ہے ۔''پیش لفظ'' میں غنی غیورؔ نے لکھا ہے کہ:

''زیر نظر کتاب میں صرف ،نحو ،صوتیات اور عروض کے تمام پہلوؤں کو مثالوں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور اُردو قواعد (از عبدالحق) اور گوجری

فونیٹک ریڈر سے مشارکت کی ہے اور اہم اضافے کئے ہیں ۔فونیٹک کے بہت سے پہلو آر۔سی ۔شرما نے چھوڑ دئے تھے ۔وہ بھی بیان کئے ہیں ۔اگلی کتابوں کو محض دوہرانے کے بجائے گرانقدر اضافہ کرنے کی کوشش کی ہے ۔یہ کتاب اُردو قالب میں ڈھائی گئی ہے ۔کوشش کی گئی ہے کہ گوجری زبان محلی کا غائر مطالعہ کتابی شکل میں پیش کیا جاسکے''۔(ص ۸ :۔۱۰)

مصنف نے ''دستور زبانِ محلی گوجری'' کو گوجری فونالوجی (صوتیات کا مطالعہ) گوجری مارفولوجی (صوتیات کی ساخت گوجری)، گجراتی و معجمی رشتہ ، گوجری ، گجراتی ہندی اور اردو کا تقابلی مطالعہ ،گوجری اور میواتی کا تقابلی مطالعہ، پنجابی اور گوجری کے مشترکہ الفاظ گوجری اُردو لپیی اور گرامر کے مسائل ، اسم فعل کا بیان ،گوجری زبان کے شاعروں کا عروضی مطالعہ کے گیارہ ابواب میں تقسیم کیا ہے ۔جن گوجری زبان کے شاعروں کا عروضی مطالعہ پیش کیا گیا ہے ۔اُن میں اسماعیل ذبیح ، رانا فضل حسین ، اسرائیل اثرؔ ، ڈاکٹر صابر آفاقی اور اقبال عظیم چودھری خاص طور پر شامل ہیں ۔بنیادی اعتبار سے یہ گوجری زبان کے گرائمر اور لسانی صورت حال کا ایک تحقیقی اور تجزیاتی فاضلانہ مطالعہ ہے جس سے اس زبان کو بولنے ، برتنے ، پڑھنے ، لکھنے اور برتنے والوں کو بڑی مدد مل سکتی ہے ۔وسیع النظری سے کام لیا جائے تو یہ حوالہ جاتی نوعیت کی دستاویز بن گئی ہے جس کے لئے غیورؔ کا یہ کام قابل قدر اور لائق تحسین و مرحبا ہے ۔

غنی غیور کی شاعری کا نیا پڑاؤ

ڈاکٹر شفق سوپوری

غنی غیور کی ادبی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ وہ شاعر ہونے کے ساتھ ایک اچھے اور سلجھے نقاد، شارح اور محقق بھی ہیں۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ شاعر یا تو شاعری سے مایوس ہو کر تنقید میں قسمت آزماتا ہے یا پھر چونکہ ہر شاعر کے اندر ایک نقاد موجود ہوتا جو اس کی راہبری کرتا ہے، وہ ناقد شاعر پر حاوی ہو کر اس کی شعری شخصیت کو کنارے پر رکھ کر آگے نکل جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں نقصان شاعری کا ہی ہوتا ہے لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ غنی غیور اس صورت کا شکار نہیں ہوئے ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ان کے تنقیدی ذہن نے ان کی شعری کائنات کی تشکیل میں نہ صرف معمار کا کردار ادا کیا ہے بلکہ اس کائنات کی تہذیب و ترتیب میں کارنامہ بھی انجام دیا۔

شاعر کے لئے یہ آسان نہیں کہ اس کے اندر چھپا ہوا نقاد اس کی شعری کائنات کی تہذیب کا کام اپنے ہاتھ میں لے کیونکہ اکثر شاعروں کی ناقدانہ حیثیت یا تو معصوم ہوتی ہے یا پھر غیر تربیت یافتہ غنی غیور کی ناقدانہ حیثیت ہر دو عیوب سے پاک ہے۔ ان کی تنقیدی ذہن نہ صرف تربیت یافتہ ہے بلکہ

ترقی یافتہ بھی ہے۔ یہ کوئی آسان بات نہیں کہ شاعر کا تنقیدی شعور بیدار اور بالیدہ ہو کر اس کی تخلیقات سے سروکار رکھے۔ اس میں کئی خطرے ہوتے ہیں۔ شاعر اپنے ہی فن پاروں پر سوال اٹھاتا ہے۔ ان کی فنی اور تخلیقی ساخت پر اعتراض کرتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ فن کی ارتقائی نہج پر کسی قسم کا سکتہ برداشت نہیں کر سکتا۔ اور اس سے بڑی بات یہ کہ ان سب چیزوں کا اجتماع ایک جینون شاعر کی شاعرانہ شخصیت کے اندر ہی نمود پاتا ہے۔ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے مجھے خوشی ہوتی ہے کہ غنی غیور ایک جینون شاعر کے طور پر ہمہ گیر تخلیقی معیار پر اترتے ہیں اور اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کی شاعری نہ یک رخی ہے اور نہ اکہری۔ ان کے خیالات میں نہ جمود ہے اور نہ ان کے بیان میں یک رنگی۔ وہ نہ صرف مضمون کی ندرت کا شعور رکھتے ہیں بلکہ اظہار کے وسائل میں بھی نئی راہوں پر چلنے کی ہمت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کی شاعری ان کے ذہن کی جستجو کا ایک ایسا سفر نامہ ہے جس کے ہر پڑاؤ پر چونکا دینے والے مناظر سے پردہ کشائی ہوئی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ مناظر صرف اور صرف غنی غیور کی ملکیت ہے کسی اور کا اس ملکیت پر اجارہ نہیں۔ شاعر بڑی مشکل سے اس مقام تک پہنچتا ہے۔

غنی غیور شعری منطق اور فنی ضوابط سے کسی بھی مقام پر دستبردار نہیں ہوتے۔ وہ نہایت شدید جذبات سے فن اور اسلوب کے درمیان تضادات کو حل کرتے ہیں۔ یہ وہ تہذیبی عمل ہے جسے میں غنی غیور کا انفراد اور اختصاص

مانتا ہوں ۔ کیونکہ یہ بت تراشی کا وہ عمل ہے جس میں پتھر پر چوٹ لگے بغیر ایک پورا وجود تشکیل پاتا ہے ۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ غنی غیور کا گلستانِ سخن خس و خاشاک سے پاک وصاف ہے ۔ ان کی شاعری نہ صرف مضمون بلکہ اظہار کی سطح پر بھی موسم کی طرح بدلتی رہتی ہے ۔

غنی غیور کے بارے میں آسانی کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ جدید شاعر ہیں ۔ جدید سے یہاں میری مراد جدیدیت کے رجحان کے حامل شاعر سے نہیں بلکہ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ غنی غیور کا شعری ذہن معاصر حسیت سے متاثر ہے ۔ لیکن اس قدر کہنے سے ان کے شعری رویے کے ساتھ زیادتی ہوگی ۔ وہ بے شک معاصر حالات کی اینچ پینچ سے متاثر ہیں اور اس کی ترجمانی بھی خوب انداز میں کرتے ہیں مگر ان کی شاعری میں جدت کاری اجتہاد کی سطح پر نمود پاتی ہے ۔ چنانچہ ان کے تجربات، مشاہدات اور معاصر حالات سے ان کا ٹکراؤ تخلیقی سطح پر اظہار پاتے وقت اپنی شکل وصورت بدل کر قاری کے احساسات کو نہ صرف انگیز کرتے ہیں بلکہ اس کے ذہن کو جھنجوڑ بھی دیتے ہیں ۔ یہ کرشمہ لسانی اور لسانی اور فکری سطح پر قاری کے ذہن کو دونوں سطحوں پر دیکھا جا سکتا ہے ۔

گر چلیں تو کدھر جائیں، کریں کیا؟
یا تو کر کے سفر جائیں، کریں کیا؟

ہم گھٹن یہاں کرتے رہیں برداشت
یا ہوا میں بکھر جائیں، کریں کیا؟

خواہشیں ہیں جواں، پیر ہوئے ہم
ہم جئیں یا کہ مر جائیں، کریں کیا؟

اتھلے پانیوں کے چرچے ہیں اور ہم
گہرے دریا کدھر جائیں، کریں کیا ؟

عشق چھوڑ کے کافر ہو مریں یا
کر کے سفر جائیں، کریں کیا؟

ہر برٹ ریڈ نے کہا تھا کہ ہمیں ہمیشہ شاعر کو استعارہ کی تخلیقی تازگی اور قوت کے ذریعہ سے پرکھنے کے لئے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے ۔ یاد رہے ارسطو نے استعارہ کو نابغہ کی نشانی قرار دیا ہے ۔استعارہ کی تازگی اور اس کی قوت کا انحصار اس بات پر ہے کہ یہ بقول شمس الرحمان فاروقی کس قدر کلام میں ایک سے زیادہ معنی پیدا کرسکتا ہے یا ایک معنی کو کس طرح مختلف پیرایوں میں ادا کر سکتا ہے ۔غنی غیور کے استعارے نہ صرف طبع زاد ہیں بلکہ ان میں ترتیب معنی وتقلیب معنی دونوں کی صلاحیتیں موجود ہیں ۔ ان استعاروں کے درمیان قاری مختلف ترنم آمیز لہروں کا زیر و بم محسوس کرتا۔سماع کے اس عالم میں

ساخت اور معنی دونوں رقص کر کے توسیع و توازن کے ایک ایسے نکتے پر ٹھہر جاتے ہیں جہاں قاری کے لئے تشفی بھی ندرت بھی اور تلذ ذ بھی۔ ملاحظہ فرمائیں۔

دیں سمندر کے بدلے انہیں خشکیاں
خشکیاں چھین لیں اور سمندر دیے

مفلسی تھی مقدر میں لکھ دی اگر
کیوں انہیں سوچ دی کس لئے سر دیے

پتھروں کے جہاں پتھریلے نصیب
بوئیں گے بھی تو کیا، کھیت بنجر دیے

وسعتیں آسماں کی دکھا کر غنی
تو نے چڑیوں کو ٹوٹے ہوئے پر دیے

ہمارے دور کی اکثر شاعری نہ تو قاری اور نہ ناقد پر کوئی گہرا اثر مرتب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمارا موجودہ ادبی معاشرہ روایت کے شعور سے عاری اور خالی ہے۔ لہذہ شاعری کیفیت کے عنصر سے خالی ہوگئی ہے۔ یہ ایک المناک صورت حال ہے کہ اب شاعر کیفیت سے زیادہ کمیت پر زور دینے لگے ہیں۔ کچھ ایسی ہی صورت تنقید کی ہے۔ ناقد اردو کی شعری

روایات سے نابلد ہو کر مغربی ادبی نظریات کی جھولتی سیڑھی پر فتوے جاری کر رہا ہے۔ علم بیان، صنائع بدائع علم عروض بحر میں زحافات یہ سب چیزیں جن پر ہمارے شعری نظام کی بنیاد استوار ہے، اب قصہ پارینہ بن کر رہ گئی ہیں۔ اب کتنے لوگ رہ گئے ہیں جو قدامہ ابن جعفر امیر عنصر المعالی ابن رشیق وغیرہ کے تنقیدی نظریات کی روشنی میں شاعری کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ شاعر اور نقاد شبلی نعمانی، حالی وغیرہ کو بھی بھول گئے ہیں۔ ایسی متنند بذب حالت میں جبکہ شاعری کا ڈی این اے مفقود ہو چکا ہے غنی غیور جیسا شاعر اس وجہ سے اہم ہیں کہ ان کی شاعری کا ڈی این اے فارسی اور اردو شعری روایات سے تیار ہوتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی شاعری روایات و رسوم کی پابند ہی نہیں بلکہ توسیع بھی ہے۔

ہم پر ہزار فتنوں کی یلغار دیکھئے
آمادۂ جفا میں جفا کار دیکھئے

شاید بیاں کرے وہ کبھی دل کی آرزو
کیا ہو نگاہِ شوق سے اظہار دیکھئے

اس بے وفا پہ کیوں نہ کروں زندگی
کیا سوچتا ہے یہ دل خود دار دیکھئے

بہلاتے دل ہیں روز نئی واردات سے
لو آگیا پھر آج کا اخبار دیکھئے

کانیں ہیں، سیم و زر کی غنی لوگ اس لئے
ان کا گھرانہ دیکھئے کردار دیکھئے

غنی غیور کی شاعری کا ایک لطیف پہلو طنز ہے۔ دراصل کبھی کبھار شاعر متناقص اور متخالف حالات سے براہ راست متصادم نہیں ہوتا بلکہ اسے اپنے پیرا یہ اظہار کو بدلنا پڑتا ہے۔ اسے ایسے حالات کے لئے PARADOXICAL سچویشن تیار کرنا پڑتی ہے۔ اور اس کے لئے طنز بہت موثر آلہ کار ثابت ہوتا ہے۔ طنز کا یہ رویہ اگر بیان کی لطافت سے عاری ہو تو اس عمل سے پھوہڑ پن ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے لئے لسانی تہذیب سے بہرہ ور ہونا ضروری ہے۔ یہ اپنے جذبات اور احساسات قاری تک پہنچانے کا سب سے افضل طریقہ ہے۔ غنی غیور نہ صرف اس فضا میں سانس لیتے ہیں جس میں متناقص حالات کی چبھن ہے بلکہ ان میں ان حالات کے خلاف رد عمل ظاہر کرنے کا تخلیقی وطیرہ بھی پایا جاتا ہے۔ ان کے طنز کی کاٹ بہت دور تک وار جس کرتی ہے۔

بہت مقبول منتر ہو گئے ہیں
کہ جوہڑ بھی سمندر ہو گئے

ترے گملوں میں اگتے ہیں ٹماٹر
ہمارے کھیت بنجر ہو گئے ہیں

سفر کرتے رہے اپنی طرح وہ
کہ دریا اب سمندر ہو گئے ہیں

ہمارے شہر کے جو آلسی تھے
وہ پیشہ ور قلندر ہو گئے ہیں

غنی غیور کی شاعری کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ شاعری قاری پر جذباتی، نفسیاتی یا احساساتی سطح پر کوئی جبر نہیں کرتی۔ یہ شاعری قاری سے ایسے مکالمہ کرتی ہے گویا غنچے کی چٹک خوشبو کی سرگوشیوں میں ہواؤں سے کچھ کہتی ہے۔ اس مکالمے میں جذبات اور احساسات کی روداد کا زیر و بم بنم کی سسکیوں سے اونچا نہیں۔ یہی وہ کیفیت ہے جو شاعری میں نشتر کا کام کرتی ہے۔ اور اس سے زیادہ کا تقاضا کرنا بھی شاعری سے واجب نہیں۔

قلب غمگیں، دیدہ گریاں تو دیکھ
قطرہ قطرہ ہے ٹپکتی جاں تو دیکھ

شوق آنکھوں کو ہے اڑنے کا مگر
پر نکالے صورتِ مژگاں تو دیکھ

خود پتنگا خود ہے وہ شمعِ مزار
بے نیاز اک دیدۂ حیراں تو دیکھ

شفق سوپوری
نوئیڈا (اتر پردیش)
۹ فروری ۲۰۲۵ء

.....

کتابیات

۱۔ کشمیر میں اردو از پروفیسر عبدالقدوس سروری
۲۔ کشمیر میں اردو از حبیب کیفوی
۳۔ ادبیات پونچھ از محمد ایوب شبنم
۴۔ شاعر ممبئی کے بعض شمارہ جات
۵۔ شیرازہ کے کے بعض شمارہ جات
۶۔ ادبیاتِ خطہ پیر پنجال از خالد انور
۷۔ دہلیز مدیر فاروق مغل پرواز
۸۔ نئی اردو غزل مولف راقم غنی غیور
۹۔ تشکیل، مدیر میر خورشید جانم
۱۰۔ زنبیل از ڈاکٹر رفیق انجم
۱۱۔ تفہیم مدیر، عمر فرحت